قیمت : -/15 روپے

مئی 2010

اردو دنیا

قومی اردو کونسل کا ماہانہ رسالہ

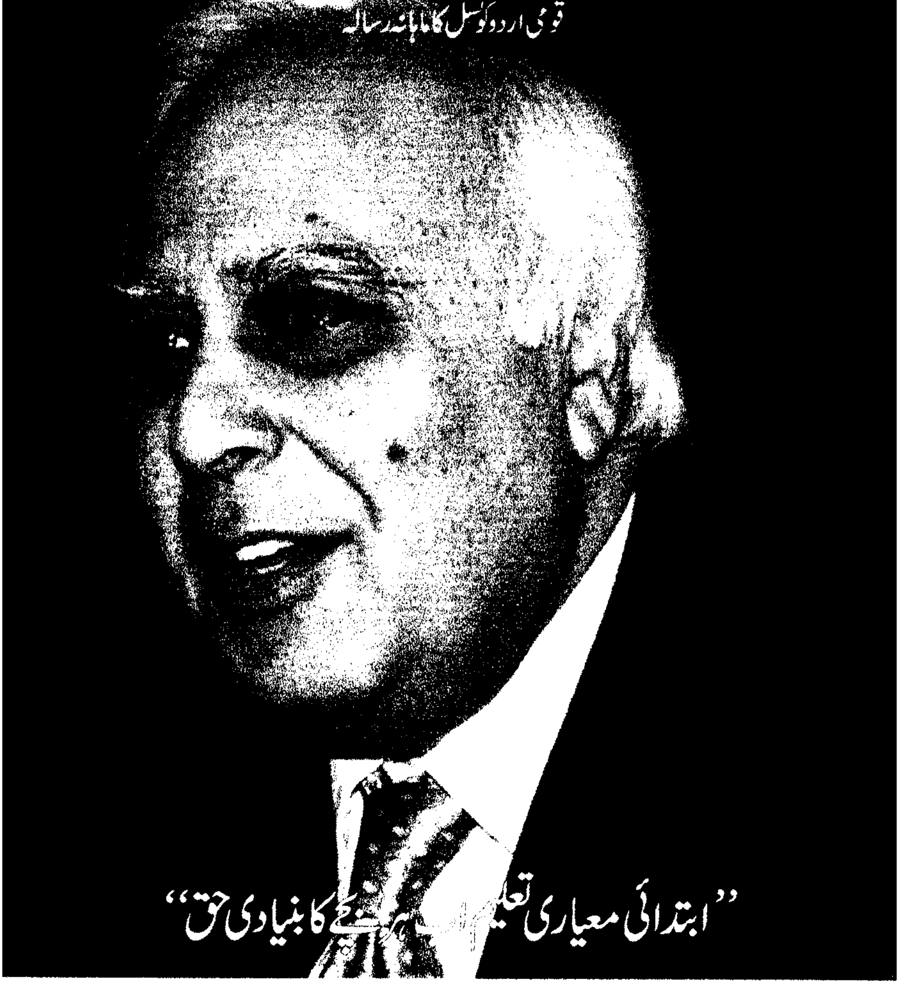

”ابتدائی معیاری تعلیم ہر بچے کا بنیادی حق“

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
شعبۂ اعلیٰ تعلیم، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

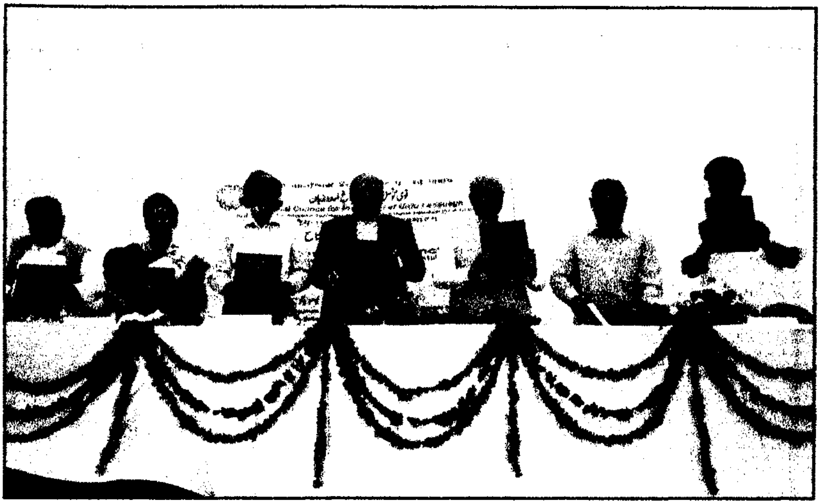

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر 'فروغ اردو بھون' کا افتتاح 27 مارچ کو عمل میں آیا۔ اس موقع پر اردو کونسل کی مطبوعات اردو انسائیکلو پیڈیا جلد 5 (اس جلد کے ساتھ انسائیکلو پیڈیا کی تمام جلدیں، جلد 1 تا 8 مکمل ہو چکی ہیں) کی رسم اجرا ادا کرتے ہوئے، دائیں سے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ، پی اے انعامدار، احمد سعید ملیح آبادی، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور کونسل کے وائس چیئرمین چندر بھان خیال، جوائنٹ سکریٹری لنگوجز انیتا بھٹنا گر جین اور پروفیسر اختر الواسع۔

اسی موقعے پر قومی اردو کونسل کی مطبوعہ کتاب 'بھارت کا آئین' (جس میں یکم مارچ 2010 تک کی ترمیمات شامل ہیں) کا اجرا کرتے ہوئے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ، پی اے انعامدار، احمد سعید ملیح آبادی اور پروفیسر گوپی چند نارنگ۔

اردو دنیا

قومی اردو کونسل کا ماہانہ رسالہ

جلد۔12، شمارہ۔4، مئی 2010

مدیر: ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

ناشر اور طابع:

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

کمپوزنگ: شہناز اختر

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا،

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/15 روپئے، سالانہ -/150 روپئے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi

کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:

فروغ اردو بھون، ایف۔سی۔ 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،

جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49562525

ویب سائٹ:

http://www.urducouncil.nic.in

email: urduduniyancpul@yahoo.co.in

urducouncil@gmail.com

شعبۂ فروخت:

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،

آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066

فون: 26109746, 26169416

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات .... قارئین کے خطوط 2

ہماری بات .... ادارہ 5

زبان اور تعلیم

● تعلیم کے حق کا مطلب صرف مفت تعلیم نہیں! .... کپل سبل 6

● تعلیم کی جانب بڑھتے قدم .... کرین ہولشوف 9

● اردو کا مقام اور ذریعۂ تعلیم: آئین ہند کے تناظر میں .... توقیر راہی 11

● فاصلاتی تعلیم اور ذریعۂ تعلیم: اگنو مانو اور مظفر پور .... حسن رضا 13

● اردو میں مستعمل عربی الفاظ و اصطلاحات .... شمس کمال انجم 15

ادب اور صحافت

● سمرسٹ مام— اپنے فکشن کے سیاق و سباق میں .... سیدہ جعفر 20

● اردو تنقید آزادی کے بعد .... مخمور سعیدی 24

● اردو فکشن کے دو بھائی .... محمد منصور عالم 27

● سائبر اسپیس میں کتب و رسائل کی اہمیت .... غضنفر اقبال 32

● اردو میں شائع ہونے والے سائنسی اور طبی رسالے .... عبدالودود انصاری 34

کلاسیکی ادب

● خواجہ میر درد اور ان کا کلام .... نسیم احمد 38

صحت اور ٹیکنالوجی

● اطلاعاتی ٹیکنالوجی اور تدریس و تعلیم .... جاوید احمد کامٹوی 40

● ابوموسیٰ جابر بن حیان: ماڈرن کیمسٹری کا بانی .... عبدالعلیم قدوائی 42

ہماری مطبوعات سے

● مدرسہ ایک سماجی اکائی کی حیثیت سے .... اے کے سی اوٹاوے 44

● نئی قومی تہذیب کی تعمیر .... سید عابد حسین 48

اردو خبر نامہ .... ادارہ 52

تبصرہ و تعارف 70

● سہ ماہی ''فکر و تحقیق'' جنوری تا مارچ 2010 .... فیروز عالم ....

● نشاط روح .... عبدالرشید اعظمی ....

● دانتے .... محمد اکبر ....

● تیز ہوا کے جھونکے (شعری مجموعہ) .... احمد کفیل ....

● اردو انشائیہ اور احمد جمال پاشا .... عبدالرب ....

● تمل ناڈو میں مسلمان .... وسیم اقبال ....

● شاد عارفی: فن اور فنکار .... ابرار احمد اعظمی ....

بچوں کا گوشہ

● حکمت عملی .... عظیم اقبال 78

● چاند، اسکول جائیں گے (نظمیں) .... شریف احمد شریف، نازاں جمشید پوری 80

آپ کی بات

■ علقمہ شبلی، ریمپن اسٹریٹ، پہلی منزل، کولکاتا۔

محمور سعیدی کی وفات شعروادب کا عظیم سانحہ ہے۔ مرحوم برسوں اردو زبان و ادب کی آبیاری کرتے رہے۔ 'اردو دنیا' سے بھی ان کی وابستگی رہی۔ ان کی کمی برابر محسوس ہوتی رہے گی۔ قطعۂ تاریخ وفات ارسال ہے۔ اگر آپ شائع کرسکیں تو ممنون ہوں گا۔

قطعۂ تاریخ وفات

گردوں مکاں مخمور سعیدی

1431ھ

ہر گام کھلاتا رہا جو پھول   صحرائے سخن کو کیا گل زار
خون اپنا دیا گلشنِ فن کو   جس سے رہیں تازہ گلِ اشعار
خاموش ہوا اس کا قلم کیا   ہے خاک بہ سر جیسے سخن زار
سناٹے کی ہے چیخ یہ ہر سمت   ویران ہوا قریۂ گفتار
ہے دل کہ عزا خانہ ہے کوئی   ہر آنکھ ہوئی جاتی ہے خوں بار
نوحہ ہے لبِ شاہدِ فن پر   ہے سوگ میں ناظورۂ افکار
گیسوئے غزل بھی ہے پریشاں   مفلوج ہوئے نظم کے کردار
کی فکر جو تاریخ کی دل نے   کہنے لگا یہ ہاتفِ بیدار

ہے مصرعِ تاریخ مکمل
مخمور سعیدی قلم کارؔ

■ فیروز عالم، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد۔500032

محترم مخمور سعیدی کی وفات ہم سب کے لیے ایک بڑا سانحہ ہے۔ وہ ایک اچھے شاعر، ادیب صحافی اور سب سے بڑھ کر ایک اچھے انسان تھے۔ قومی اردو کونسل میں ان کی موجودگی ہمارے لیے باعث افتخار تھی۔ شعبۂ ادارت میں جو لوگ بھی رہے ان کی ذہنی و فکری نشو ونما میں مخمور صاحب کا اہم کردار رہا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے جب یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد کونسل جوائن کی تھی تو مجھے کوئی عملی تجربہ نہیں تھا۔ آپ کی تربیت اور مخمور صاحب کی شاگردی میں میں نے ایڈیٹنگ کی الف ب سیکھی۔ اس زمانے میں مختلف قسم کی جوذمے داریاں نبھائیں ان کی اہمیت آج سمجھ میں آتی ہے۔ آپ نے اسپیشلسٹ نہیں آل راؤنڈر تیار کیے جو کونسل اور کونسل سے باہر اپنا اور آپ کا نام اونچا کر رہے ہیں۔ ابتدائی دنوں میں کام کے بوجھ اور اپنی ناتجربہ کاری سے کبھی کبھی میں حوصلہ ہارنے لگتا یا پریشان ہوتا تو مخمور صاحب کہتے! تیرا کی سکھانے کا طریقہ یہ ہے کہ سیکھنے والے کو پانی میں چھوڑ دیا جائے، جب وہ ڈوبنے لگے گا تو کنارے آنے کے لیے خود ہی ہاتھ پاؤں مارے گا اور اس طرح تیرنا سیکھ جائے گا۔ اللہ سے دعا ہے کہ انھیں اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

'اردو دنیا' اور 'فکر و تحقیق' کی ادارت میں وقتی طور پر ضرور دقت پیش آئے گی لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ کی مردم شناس نظریں پھر کوئی صاحب نظر تلاش کرلیں گی۔ مجھے علامہ اقبال کا ایک شعر یاد آرہا ہے، جو آپ اکثر سناتے تھے۔

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

■ راشد جمال فاروقی، ٹاؤن شپ ویربھدرا، رشی کیش، دہرادون۔

'اردو دنیا' اپریل موصول ہوا۔ شکریہ!

مجھے قوی توقع بھی تھی کہ یہ شمارہ مرحوم ومغفور مخمور سعیدی کے فن اور شخصیت کا احاطہ کرے گا۔ محترم چندر بھان خیال کا منظوم خراج عقیدت نہایت پر اثر ہے باقی مقالات بھی خوب ہیں لیکن فضل الرزاق خاں ارشد کے مضمون سے مرحوم کی ایک نئی تصویر بھی ابھر آئی جوان کے خلوص اور شفقت کی علامت ہے۔ دسمبر 2009 میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے بین الاقوامی مشاعرے میں شرکت کرنے دہلی گیا تھا وہاں مخمور صاحب سے آخری ملاقات اب بہت یاد آرہی ہے۔

■ مرزا رفیق شاکر، حاجی نگر، آکوٹ فیل، آکولہ۔444003

اہلِ دانش مخمور سعیدی صاحب

(1431ھ)

کیسے نہ ہو افسوس جو راہی نے کہا ہے
شامل ہوئے مخمور بھی اب لحد نشیں میں
شاکر کے لبوں پر بھی ہیں بخشش کی دعائیں
رحمت بھی سبھی نکہت بھی ہو مرقد کی زمیں میں

محشر میں بھی شاد ہوں سن کر یہ صدائیں
'مخمور سعیدی' جو ہیں غلط برین' میں
(2010)

■ ایم رانگھرداوی، ساداتھ سول لائنس، چھندواڑہ۔

'اردو دنیا' پابندی سے مل رہا ہے، مارچ 2010 کے شمارے میں شائع سبھی مضامین معلومات افزا ہیں۔ رسالہ آپ کی ادارت میں تیز گامی سے منزل مقصود کی طرف رواں ہے۔

احمد طارق کا مضمون، اردو کی تاریخی اور سماجی اہمیت، بہت پسند آیا۔ اردو زبان نے ابتدا سے ہی سیکولر کردار اپنایا۔ اس نے مختلف زبانوں کے الفاظ کو اپنے دامن میں جذب کیا، اور پورے سماج کو ایک رشتہ محبت میں پرونے کا کام کیا۔

محمد حسن فاروقی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ تخلیقی صلاحیتوں کے امکانات کی شناخت اور فروغ کی کوشش نہ ہونے کی وجہ سے بچوں کی تخلیقی صلاحیتوں کا سرمایہ ضائع ہو رہا ہے۔

تخلیق 'گلشن ریکھا کے پار' اپنے دلکش انداز بیان کی وجہ سے بے حد دلچسپ ہوگئی ہے۔

ہر زبان کی اپنی ایک تہذیب ہوتی ہے۔ زبان قوم کی شناخت بھی ہوتی ہے۔ اسد رضا نے 'صحافتی ترجمے کے مسائل' پر خوب لکھا ہے، کسی بھی زبان کو بنانے اور بگاڑنے میں اخبارات اہم رول ادا کرتے ہیں، ترجمے کے مسائل پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

کہانی 'درختوں کی لڑائی' بے حد اچھی لگی، درختوں کی کم ہوتی ہوئی تعداد کی وجہ سے کائنات کا توازن بگڑ رہا ہے، درختوں نے اپنی مضبوط بانہوں میں زمین کو جکڑ رکھا ہے، جس کی وجہ سے یہ زلزلوں سے بچی رہتی ہے۔

'اردو خبرنامہ' اور 'تبصرہ' 'تعارف' معلومات فراہم کرتے ہیں۔

■ اسماعیل پرواز، زینت کوچنگ کیریئر، بلیلیس روڈ، ہاوڑہ۔ (بنگال)

'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ ملا۔ گھنٹوں مطالعے میں مصروف رہا کیونکہ میں نے جہاں رسالہ رکھا میری بہو شگفتہ نسرین اچک لے گئی اور میں اس سے فوراً طلب بھی نہیں کرسکتا۔ دراصل 'اردو دنیا' اتنے اچھے اور معلوماتی مضامین پر مشتمل ہوتا ہے کہ خبر مل جانے پر اردو کا ہر قاری پڑھنے کے لیے بے قرار ہوتا ہے، سائنس اور ٹکنالوجی سے لے کر کلاسیکی ادب تک تقریباً ہر موضوع پر ٹھوس مضامین ہیں۔ 'اردو کی تاریخ اور سماجی اہمیت' ایک اچھا تحقیقی مضمون ہے۔ اردو ادب کے ساتھ اردو کے وسیلے سے سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم حاصل کرنے والے اسٹوڈنٹس کو کافی فائدہ پہنچائیں گے۔ 'اردو خبرنامہ' کے ذریعے تقریباً ہر صوبے کی تحریکات سے قارئین واقفیت حاصل کرتے ہیں۔

نہایت نفیس کاغذ، عمدہ طباعت اور شاندار گٹ اپ کے ساتھ 'اردو دنیا' اردو والوں کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی طرف سے ایک نادر تحفہ ہے۔ سبھی لکھنے والوں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور آپ کی مساعی جمیلہ کو داد و تحسین کا نذرانہ !!

بچوں کا گوشہ بھی سبق آموز کہانی سے منور ہے۔

■ ریاض جعفری، امیر خسرو سوسائٹی، (یو۔کے) [لندن]

سب سے پہلے تو آپ کو 'اردو دنیا' میں واپسی کے لیے تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں بعد ازاں عرض یہ ہے کہ 'اردو دنیا' باقاعدگی سے موصول ہو رہا ہے نہایت ہی معلوماتی رسالہ ہونے کے باعث ہمارے ہاں کافی مقبول ہے۔ پہلے ہمارے ارکان کی نظروں سے گزرتا ہے اور پھر اسے مقامی لائبریری کو دیا جاتا ہے تاکہ عوام الناس بھی اس سے مستفید ہوسکیں۔

حال ہی میں معلوم ہوا ہے کہ گوپی چند نارنگ کو جامعہ ملیہ اسلامیہ نے ڈی لٹ (D. Lit) کی ڈگری سے نوازا ہے یقیناً یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے مگر ہمارے نزدیک ان کا مقام ایسی ڈگریوں سے اعلیٰ ہے دیار غیر کے اردو حلقوں میں جو مقام پروفیسر گوپی چند نارنگ کا ہے وہ عقیدت کے بام ثریا سے بھی اونچا ہے۔ مسلسل اور متواتر علالت کے باعث میری ان سے عرصے سے ملاقات نہیں ہوسکی۔

■ مومن محیز الدین محسن

میں (مومن محیز الدین) سوامی راما نند تیرتھ مراٹھواڑہ یونیورسٹی ناندیڑ کے منظور اردو ریسرچ سینٹر 'مہاراشٹر اودے گری کالج' اودگیر سے ڈاکٹر مقبول احمد مقبول کی زیر نگرانی 'مہاراشٹر میں اردو ڈرامہ: آزادی کے بعد' کے زیر عنوان پی ایچ ڈی کے لیے تحقیقی مقالہ لکھ رہا ہے۔ لہٰذا مہاراشٹر کے تمام ڈرامہ نگاروں سے پر خلوص اپیل کرتا ہوں کہ اپنے ڈراموں کے مجموعے مع تفصیلی تعارف درج ذیل پتے پر ارسال کر کے میرے تحقیقی کام میں اعانت فرمائیں:

راج محمد درگاہ روڈ، اودگیر۔413517، ضلع۔ لاتور (مہاراشٹر)

■ ایم ہاشم قدوائی

'اردو دنیا' کے مارچ 2010 کے شمارے میں خاکسار کی کتاب 'جدید ہندوستان کے سیاسی اور سماجی افکار' پر عاقل زیاد کا گراں قدر تبصرہ نظر سے گزرا۔ اس وقیع تبصرے کے لیے تبصرہ نگار کا ممنون اور شکرگزار ہوں۔

اس کی تشریح ضروری تھی کہ یہ کتاب علم سیاسیات کی شاخ سیاسی فکر Political thought پر ہے۔

البتہ تبصرہ نگار کے اس خیال سے اتفاق کرنا مشکل ہے کہ علی گڑھ

تحریک کے بانی اور اے ایم او کالج کے موسس Founder مذہبی امور کی پاس داری سے کبھی غافل نہیں رہے۔

اس شمارے کے متعدد مضامین، اردو کی تاریخی و سماجی اہمیت، طلبہ کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشونما، صحافتی ترجمے کے مسائل بہت زیادہ پسند آئے۔

■ احمد طارق

ممنون کرم ہوں کہ آپ نے میرا مضمون ماہنامہ 'اردو دنیا' میں شائع کیا۔ خط لکھنے میں تاخیر کا باعث بریلی شہر کے فرقہ وارانہ حالات، کرفیو اور ان سب کے سبب رسالے کا نہ پہنچنا رہا۔ مارچ کا شمارہ اب تک دستیاب نہیں ہوا۔ یہ اچھا ہوا کہ کسی خیر خواہ نے فون پر نہ صرف اطلاع دی بلکہ اپنی کاپی بھی بذریعے ڈاک روانہ کردی۔ آپ نے جس کمال ہنر مندی سے مضمون کو ایڈٹ کرایا ہے اس سے اس کے تیکھے پن میں اضافہ ہوگیا ہے۔ کرفیو کے ایام میں ایک مضمون قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری سے متعلق تیار ہوگیا ہے۔ انشاء اللہ اسے صاف کرکے فکر و تحقیق کے لیے روانہ کروں گا۔ ایک مرتبہ پھر آپ کی عنایات کے لیے شکریہ۔

■ حاجی منیرالدین ملا، سرور شکشن منڈل ساؤتھ سانگلی

'اردو دنیا' گزشتہ آٹھ سال سے میرے زیرِ مطالعہ ہے اور ہر لحاظ سے مجھے پسند ہے۔ بھارت ہی کیا بلکہ دنیا بھر میں اس معیار کا رسالہ شائع ہوتا ہو۔ خدا اس عہدے پر قائم دائم رکھے اور صحت یابی اور عمر درازی عطا فرمائے۔

سانگلی (مہاراشٹر) کا علاقہ ویسے دیکھا جائے تو اردو کے لیے بنجر اور سنگلاخ علاقہ ہے، کوشش جاری ہے۔ نظر صرف نئی پود کی جانب ہے پرائمری اسکولوں کی جماعت اول میں کتنے بچے داخل ہوئے اس بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جماعت اول کے ٹیچروں کو انعامات دیا کرتے ہیں۔ گزشتہ ماہ کے رسالے میں 'بچوں کا گوشہ' کے صفحے بڑھانے کی بات چلی تھی، صفحات ضرور بڑھایئے وہ بھی مصور ہوں تو سونے پر سہاگا۔

■ فیروز، ولیج آفس کے قریب، پناراکی پوسٹ، ضلع۔ کنور (کیرالہ)

'اردو دنیا' فروری کا شمارہ ملا۔ حسب معمول تمام مضامین پسند آئے۔ اداریہ سے قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں سے باخبر ہوا اور اس خبر سے خوش ہوا کہ قومی اردو کونسل کی اپنی عمارت تیار ہوگئی ہے۔

'آپ کی بات' میں تمنا مظفر پوری کا خط پڑھا اور میں بھی اس کی تائید کرتا ہوں کہ بچوں کے گوشے کے صفحات بڑھادیں اور کہانی کے علاوہ دوسرے دلچسپ مضامین بھی شامل اشاعت کریں۔

سلیمان اطہر جاوید کے مضمون 'اردو زبان۔ نئے افق' میں جدہ میں منعقد عالمی اردو کانفرنس پر مختصر جائزہ پڑھا اور اردو زبان کی پر امید کرنیں نئے افق پر چمکتی نظر آتی ہیں۔

محمد شجاعت علی راشد کا مضمون 'اردو۔ اکیسویں صدی میں' پڑھ کر اردو زبان کے فروغ کے متعلق کافی امید افزائی ہوئی۔ یہ سچ ہے کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا قیام اردو تعلیم و تدریس میں ایک اہم موڑ ہے۔ اس کے ساتھ قومی اردو کونسل کی کاوشوں سے بھی اردو زبان کی ترقی اور تعلیم پر نئے امکانات نظر آتے ہیں۔

■ آفاق عالم صدیقی، زبیدہ ڈگری کالج، جے نگر، شکاری پور شموگا، کرناٹک

گھر سے واپس آیا تو 'اردو دنیا' کے دو شمارے (فروری اور مارچ، 2010) دیکھنے کو ملے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ نے میرا مضمون اردو زبان و ادب کی تدریس کے مسائل، فروری کے شمارے میں شائع کر دیا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ایڈیٹنگ کے بعد مضمون کی اہمیت کم ہوگئی ہے، مگر یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ اخلاقاً اس بات کا ذکر ہو جانا چاہیے تھا کہ مضمون ایڈٹ کر کے شائع کیا گیا ہے، یا یہ کہ مضمون کو مختصر کر دیا گیا ہے۔

محترمی مخمور سعیدی کے انتقال سے یقیناً ان تمام اردو دوست لوگوں کو رنج پہنچا ہے جو مرحوم کی خدمات سے واقف تھے۔ آپ کی واپسی نے ادارے سے بہت ساری امیدیں وابستہ کردی ہیں۔ امید ہے کہ آپ کی سربراہی میں قومی کونسل نئے سنگ میل پار کرے گی۔

● تھوڑی بہت ایڈیٹنگ سبھی مضامین میں ہوتی ہے اور اس کا مقصد صرف نفسِ مضمون کی ترسیل عام کو یقینی بنانا ہوتا ہے اور کچھ نہیں۔ ہر مضمون کے ساتھ ایڈیٹنگ کی صراحت کرنا عجیب سا لگے گا۔

■ انور رشید، وارانسی۔

کتاب میلے کے حوالے سے ضروری بات یہ کہ آپ لوگ صرف سال میں ایک ہی مرتبہ میلے کا اہتمام کرتے ہیں بہت سارے شہر Cover نہیں ہو پا رہے ہیں جیسے اورنگ آباد (مہاراشٹر)، مظفر پور (بہار) وارانسی یا مو، جموں و شری نگر، بھوپال، جے پورے صوبے کے بھی کسی شہر میں رکھیں۔ اگر ایسا نہ کرسکیں تو کم از کم آپ لوگ Mini Book Fair کے نام سے پانچ روزہ کتاب میلے کا اہتمام کریں اور ہر سال 5 شہر کو ٹارگیٹ بنا کر ملک بھر میں مقامی پبلشرز یا بڑے دوکاندار کے تعاون سے کریں فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے ایک مشورہ میرے ذہن میں تھا۔

□□□

ہماری بات

خوش نصیب ہیں عصرِ حاضر کی انسانی آنکھیں جو اُن واقعات کی شاہد بن رہی ہیں جن سے آئندہ نسلوں کی تقدیر متعین و متشکل ہوگی۔ اپریل کے مہینے کی پہلی تاریخ کو لوگ عموماً مذاق میں لیتے ہیں۔ لیکن یکم اپریل 2010 کی تاریخ کو مستقبل کا ہندوستان ایک ایسے سنجیدہ انقلابی دن کے طور پر یاد رکھے گا جس کا اس ملک سے ناخواندگی کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے کا باعث و محرک بننا مقدر ہو چکا ہے۔

حصولِ تعلیم کو ہر ہندوستانی کا بنیادی آئینی حق قرار دینا یقیناً ایک انقلابی قدم ہے۔ گزشتہ چھ سال میں یہ اپنی نوعیت کا دوسرا واقعہ ہے، جس کی بدولت ہمارے ملک کی سماجی تصویر بدلنے والی ہے۔ پہلا واقعہ تھا حصول معلومات کے حق کے نفاذ کا جس نے سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کی کارکردگی اور نظم و نسق میں شفافیت لانے کا عمل اس تیزی سے اور اس قدر کامیابی سے شروع کیا ہے کہ کئی بار یقین ہی نہیں آتا کہ ہم اسی ملک میں جی رہے ہیں، جہاں سرکاری دفتر یا پولیس تھانے کا افسر یہ بتانے کا بھی پابند نہیں تھا کہ کسی معاملے میں کوئی پیش رفت ہوئی ہے یا نہیں۔ آج ہم دس روپے کی فیس بھر کر اس افسر سے یہ جان سکتے ہیں کہ فلاں معاملے کی فائل اب کس مرحلے میں ہے، فلاں کام کس ٹھیکیدار کو کن شرائط پر سونپا گیا ہے اور یہ کہ خود اس نے تو کوئی ذاتی فائدہ حاصل نہیں کیا۔

معلومات کا یہ حق جس طرح بدعنوانیوں کے خاتمے کے لیے ایک مؤثر ہتھیار ثابت ہو رہا ہے اسے دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔

تعلیم کا حق بھی ایک ایسا ہی اوزار ہے جو مستقبل میں ہمارے سماج کی تصویر کو مزید بہتر اور دلکش بنانے والا ہے۔ سماجی و اقتصادی طور پر پچھڑی اور پورے ملک میں پھیلی ہوئی وہ زبردست افرادی قوت جو تعلیم کی سہولتیں نہ ملنے کی وجہ سے اپنی پوری استطاعت و اہلیت کے ساتھ قومی ترقی و خوشحالی کے عمل میں حصہ نہیں لے پاتی، اُسے تعلیم کا یہ بنیادی حق بہتر صلاحیتوں اور جدید ہنرمندیوں سے آراستہ کرنے اور اس کی توانائی میں مزید اضافے کا سبب بنے گا۔ مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل جناب کپل سبّل کے لیے بھی یہ امر باعث افتخار ہونا چاہیے کہ ان کی رہنمائی اور کاوشوں سے تعلیم کے حق کا نہ صرف بل پارلیمنٹ میں منظور ہوا بلکہ اس کے نفاذ کا عمل بھی ان ہی کی قیادت میں شروع ہوا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ صرف اعلان اور کاغذی کارروائیوں سے یہ حق سب کچھ بدل کر نہیں رکھ دے گا۔ اس میں کچھ وقت ضرور لگے گا۔ خطیر سرمایہ فراہم ہوگا۔ ہزاروں نئے اسکول کھلیں گے۔ لاکھوں نئے اساتذہ کی تقرری ہوگی۔ جو لوگ انتہائی غربت کی وجہ سے اپنے بچوں اور اُن کے بچپن کو تعلیم کی بجائے روزگار میں مصروف رکھنے پر مجبور ہیں، انھیں اقتصادی تحفظ دینا ہوگا۔ یہ سب کیا جائے گا تب کہیں جا کر دس بارہ برس میں نئی نسل کی وہ فصل تیار ہوگی جو قوم کو خوشحالی کی نئی منزلوں سے ہم کنار کر سکے گی۔ اور جب پورا ہندوستان پڑھا لکھا ہوگا۔

یہاں ہم اردو والوں کے لیے بھی ایک موقع ہے۔ اب جب کہ پورا ملک تعلیم کے حق کو عملی شکل دینے کی تیاری میں جٹ رہا ہے، ہم اردو والوں کو بھی یہ دیکھنا چاہیے کہ ہم اپنی زبان کو فروغ دینے کے لیے تعلیم کے حق کا کس طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اردو دانشوروں اور اسکالرز کے لیے یہ ایک اہم موقع ہے کہ وہ اِس ہندوستانی زبان کی ترقی کو 'حق تعلیم' کے نفاذ کے ساتھ جوڑنے کے طریقے تلاش کریں تاکہ اِس حق کی بدولت جب پورا ملک خواندگی کے دائرے میں آ جائے تو اس مکمل خواندگی میں اردو کی اپنی خاطر خواہ جگہ موجود ہو۔

آخر میں ایک بات اور۔ یکم اپریل سے ملک میں اعداد و شمار اور ڈاٹا بیس Data Base کے لحاظ سے دنیا کی سب سے بڑی مردم شماری کا کام بھی شروع ہو گیا ہے۔ ہم اردو والوں کا فرض ہے کہ اس سلسلے میں سرکاری کارندوں کے ساتھ مکمل تعاون کرتے ہوئے اپنی مادری زبان کے خانے میں 'اردو' درج کرائیں اور یہ دیکھ لیں کہ اندراج درست ہوا ہے یا نہیں۔ یاد رکھیں اردو کی ترقی کے لیے یہ اندراج کلیدی اہمیت رکھتا ہے!

□□□

کپل سبل

تعلیم کے حق کا مطلب صرف مفت تعلیم نہیں!

بچوں کو تعلیم کا حق مہیا کرانے کی ملک کی جدو جہد کے سلسلے میں ہم نے ایک تاریخی سنگ میل طے کر لیا ہے۔ آئین کی (86ویں ترمیم) سے متعلق 2002 کے ایکٹ کا نفاذ جس کے تحت ابتدائی تعلیم کو بنیادی حق قرار دیا گیا تھا اور جس کے نتیجہ کے طور پر بچوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم کے سلسلے میں آر ٹی ای ایکٹ 2009 کی تشکیل کی گئی تھی، روبہ عمل ہو چکا ہے۔ اس حق کی عمل آوری 100 برسوں پر محیط ہماری اس جدو جہد کی عکاس ہے، جو ہم سب کے لیے ابتدائی تعلیم مہیا کرانے کے سلسلے میں کرتے رہے ہیں۔ صورتحال یہ ہے کہ بچوں کی نشو ونما، ان کی شخصیت و کردار سازی کے سلسلے میں تعلیم کی اہمیت کا احساس آج ملک کے امیر سے امیر اور غریب سے غریب ترین طبقے کو بھی پوری طرح ہو چکا ہے اور اسی لیے بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں سہولتوں کی مانگ میں بھی گزشتہ برسوں کے دوران کافی اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ ابتدائی تعلیم کی سہولیات مہیا کرائے جانے کے موضوع پر ملک میں مختلف سطحوں پر گزشتہ کئی برسوں کے دوران لگا تار مباحثے ہوتے رہے ہیں۔ منتظمین، طلبہ کے اسکولوں میں اندراج، پیدل مسافت کی قریب ترین دوری پر اسکول کی دستیابی، بنیادی ڈھانچے کی فراہمی اور اساتذہ کی تقرری پر اپنی توجہ مرکوز کرتے رہے ہیں، جب کہ تعلیمی ماہرین کی تشویش کا مرکز بچوں کی تعلیم کی کوالٹی، معیار و نصاب کو بہتر سے بہتر بنایا جاتا رہا ہے۔ اس مقصد کے حصول میں ٹیوشن مراکز یا والدین کی جانب سے بھی برابر تعاون حاصل ہوتا رہا ہے۔ ترقیاتی ماہرین، اسکول میں گزارے گئے برسوں اور طلبہ پر ہونے والے ان کے اثرات مثلاً شادی کی عمر اور کنبے کے سائز پر بھی تبادلۂ خیال کرتے رہے ہیں۔ اقتصادی ماہرین تعلیم کے شعبہ میں کی جانے والی سرمایہ کاری سے حاصل شدہ معاشی فوائد کو اپنی بحث کا موضوع بناتے رہے ہیں۔ والدین کی جانب سے بھی برابر اس بات پر توجہ دی جاتی رہی ہے کہ نظام تعلیم کے تحت ان کے بچوں کو تعلیم کے زیور سے اس طرح آراستہ کیا جائے کہ وہ ان کے لیے اچھی ملازمت یا روزگار اور اقتصادی خوشحالی کا ذریعہ بن سکے۔

تعلیم کے بنیادی حق کا نفاذ اس طرح ہمیں ایک ایسے مشن کے آغاز کا موقع فراہم کرتا ہے، جس کے تحت ہم سب کے لیے ابتدائی تعلیم کے اپنے نصب العین کے حصول میں مذکورہ بالا سبھی اہم پہلوؤں کو شامل کر سکتے ہیں۔

رائٹ ٹو ایجوکیشن ایکٹ کے تحت بچوں کے اسکول میں مفت اور لازمی داخلے، حاضری اور ابتدائی تعلیم کی تکمیل کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آزادی کے بعد گزشتہ 6 دہائیوں کے دوران، تعلیم کے شعبہ میں نمایاں پیش رفت عمل میں آئی ہے اور سماج کے مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے اب زیادہ سے زیادہ بچوں کا رجحان اسکولی تعلیم کی جانب ہوتا جا رہا ہے۔ اندراج کے اعداد و شمار پر اگر ہم نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ اسکولوں میں زیر تعلیم بچوں کی شرح تقریباً 100 فیصد ہے، 98 فیصد بستیوں میں ایک کلو میٹر کے اندر اندر پرائمری اسکول کی تعلیمی سہولتیں مہیا کرائی جا چکی ہیں اور 92 فیصد بستیاں ایسی ہیں، جہاں 3 کلو میٹر کے اندر اندر Upper پرائمری اسکول موجود ہیں۔ پرائمری تا Upper پرائمری سطحوں کی عبوری شرح میں بھی کافی بہتری واقع ہوئی ہے۔ تاہم اس کے باوجود کچھ بچے ایسے ہیں، جو اب بھی اسکولی تعلیم سے محروم ہیں، جو فیکٹریوں اور کارخانوں میں بندھوا مزدوروں کے طور پر کام کرتے ہیں یا وہ ایسے بچے بھی ہیں، جو مویشیوں کو چراتے ہیں یا ڈھابوں پر کام کرتے ہیں اور کچھ ایسی بچیاں ہیں، جو کھیتوں اور گھروں میں رہ کر یا تو گھریلو ملازماؤں کے طور پر کام کرتی ہیں یا اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں یا کچھ ایسے بچے ہیں جنھیں بچپن میں ہی شادی کے بندھنوں میں جکڑ دیا جاتا ہے۔ ان میں کافی بڑی تعداد ایسے بچوں کی بھی ہوتی ہے، جن کا اسکولوں میں باقاعدہ اندراج ہو چکا ہوتا ہے، تاہم یا تو وہ بیچ میں ہی

پڑھائی چھوڑ بیٹھتے ہیں یا ایک بار اندراج ہونے کے بعد دوبارہ وہ اسکول کا رخ ہی نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ بہت سے ایسے بچے بھی ہیں، مثلاً نقل مکانی کرنے والے یا اسٹریٹ چلڈرین، جو بے حد غیر محفوظ اور انتہائی غربت کے حالات کا شکار ہو جاتے ہیں، ایسے بچوں کو تعلیم کی سہولتوں سے محروم کیا جانا انسانی حقوق کے ہمہ گیر نوعیت کی نفی کرنے کے ہی مترادف ہے اور ہمارے لیے اب یہ ناکافی ہے کہ ہم ان بچوں کے لیے تعلیمی سہولتوں کی فراہمی کا محض ذکر ہی کرتے رہیں۔

اگرچہ اسکولی تعلیم کا ان بچوں کو مہیا کرایا جانا ناگزیر اہمیت کا حامل ہے، تاہم محض سہولیات کی انھیں فراہمی ہی کافی نہیں ہے، کیوں کہ اس بات کو یقینی نہیں بناتی کہ اس طرح یہ سبھی بچے اسکول جانے لگیں گے اور وہاں تعلیم حاصل کرنے لگیں گے۔ اسکول میں تعلیمی سہولیات کی موجودگی کے باوجود یہ ضروری نہیں ہے کہ بچے وہاں جاکر تعلیمی سہولتوں کا فائدہ بھی اٹھا سکیں یا وہ کچھ ماہ بعد بیچ میں ہی تعلیم کو ترک نہ کر بیٹھیں۔ اسکول اور سماجی جائزے کے ذریعے ہمیں ان سبھی سماجی، معاشی، ثقافتی، لسانی اور معلمانہ وجوہات کا پتہ لگانا ہوگا، جن کی وجہ سے پچھڑے و کمزور طبقات سے تعلق رکھنے والے یہ بچے اور بچیاں بھی باقاعدگی کے ساتھ اسکول میں حاضر نہیں ہو پاتے اور اپنی ابتدائی تعلیم بھی مکمل نہیں کر پاتے۔ اس سلسلے میں تمام تر توجہ غریب ترین اور سب سے زیادہ کمزور طبقات کے بچوں پر ہی دی جانی چاہیے، کیوں کہ یہی وہ گروپ ہیں جو سب سے زیادہ وسائل کی کمی کا شکار رہتے ہیں اور جن کو تعلیم کے حق سے محروم کیے جانے اور اس حق کی ان کے تئیں خلاف ورزی کے امکانات عام طور پر زیادہ رہتے ہیں۔

رائٹ ٹو ایجوکیشن کا مطلب محض مفت اور لازمی تعلیم ہی نہیں ہے، درحقیقت سبھی کے لیے معیاری تعلیم کا پہلو بھی اس میں شامل ہے اور تعلیم کی کوالٹی اس کا جز و لاینفک ہے۔ اگر تعلیمی عمل میں کوالٹی کا فقدان ہو تو وہ بھی بچوں کو ان کے حق سے محروم کیے جانے کے مترادف ہی ہے۔ اس ایکٹ کے تحت اس بات کی گنجائش رکھی گئی ہے کہ نصاب تعلیم ایسا ہو جس میں بچوں کو سرگرمیوں، گہرے مطالعے اور دریافت و انکشافات کا موقع مل سکے۔ اس طرح ہمارے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ بچوں کے ذریعہ علم کے حصول اور کتابوں کو امتحانات کی بنیاد بنانے سے متعلق اپنے روایتی نظریات میں بغیر کسی چون و چرا کے ہم تبدیلی لائیں۔ درس و تدریس اور علم کے حصول کے عمل کو ذہنی دباؤ اور بوجھ سے پوری طرح آزاد ہونا چاہیے اور اس نظام کو بچوں کے موافق بنانے کے لیے نصاب تعلیم میں ہمیں وسیع پیمانے پر اصلاحی عمل کی شروعات کرنی ہوگی۔ ایک ایسا نظام جو نہ صرف بچوں کی تعلیمی ضروریات سے مطابقت و مناسبت رکھتا ہو، بلکہ انھیں بااختیار بھی بنائے۔ اساتذہ کی جوابدہی کے تحت بھی انتظامات و عملی کارروائی کے ذریعے ہمیں اس بات کو یقینی بنانا ہوگا کہ بچوں کا تدریسی عمل کارگر ثابت ہو رہا ہے اور ایک دوستانہ ماحول میں ان کے تدریسی حق کی کسی بھی طرح کی خلاف ورزی نہیں کی جا رہی ہے۔ بچوں کے ٹسٹ اور جائزے سے متعلق نظاموں کی از سرنو جانچ پڑتال و تشکیل نو کا کام اس طرح کیا جانا چاہیے کہ بچے اسکول اور ٹیوشن مراکز کے درمیان چکر کاٹتے کاٹتے اپنا بچپن ہی نہ گنوا بیٹھیں۔ ہمیں اس ایکٹ کا جائزہ بچوں کے خیالات کو ذہن میں رکھ کر ہی لینا چاہیے۔

اس کے تحت ہمارے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم بچوں کو ایک ایسی تعلیم کا حق مہیا کرائیں، جو خوف، دباؤ اور فکر و تشویش سے پوری طرح آزاد ہو، اس ایکٹ میں ایسی بہت سی دفعات رکھی گئی ہیں جن کے تحت جسمانی سزا یا مار پیٹ، بچے کو چھٹی کے بعد اسکول میں روکنے اور اسکول سے اس کا نام خارج کرنے جیسی سرگرمیوں کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ یہ اس بات کا متقاضی ہے کہ ڈسپلن اور کنٹرول سے متعلق اپنے روایتی نظریات کا ہم نہ صرف از سرنو جائزہ لیں، بلکہ اساتذہ و بچوں و اساتذہ اور والدین کے درمیان تعلقات اور کلاس روم کے نظم و ضبط سے متعلق اپنے موقف کے کچھ متبادل بھی ہم تلاش کریں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسکولوں میں بنیادی ڈھانچہ، تربیت یافتہ اساتذہ، نصاب، درس و تدریس سے متعلق ساز و سامان اور مڈ ڈے میل کی فراہمی کی ذمے داری اگرچہ مرکز و ریاست کے تعلیم کے محکموں کی ہی ہے، تاہم سب کے لیے ابتدائی تعلیم اور اس کی بنیادی حق کے طور پر تشکیل کے نصب العین کے حصول کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ پوری حکومت ہی اس کے لیے سرگرم ہو۔ مختلف شعبوں کے درمیان اشتراک و تعاون کو یقینی بنانے کے لیے ایک مربوط میکنیزم بھی ضروری

ہے۔ مالیات سے متعلق محکموں کی جانب سے اس مقصد کے حصول کے لیے سبھی سطحوں پر مناسب مالی تخصیص اور رقومات کا بروقت جاری کیا جانا بھی ناگزیر اہمیت کا حامل ہے۔ رفاہ عامہ کے محکموں کو معلمانہ تناظر سے ہٹ کر اسکول کی عمارتوں کے از سر نو ڈیزائن تیار کرنے ہوں گے، اس بات کو بھی یقینی بنانا ہوگا کہ ان عمارتوں میں معذور بچے بھی بہ آسانی داخل ہوسکیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی سے متعلق محکموں کو بھی زمینی سطح پر اسکولوں کی عمارات کی تعمیر کے لیے جگہ کے انتخاب اور خصوصی ٹکنالوجیوں کی فراہمی اور سماجی پہلوؤں کے جائزے کی پوری ذمے داری لینی ہوگی۔

پانی اور صفائی ستھرائی سے متعلق پروگراموں کے تحت اس بات کا بھی یقینی بنایا جانا ضروری ہے کہ اسکول میں پینے کے صاف پانی اور بالخصوص بچیوں کے لیے صفائی ستھرائی کا معقول انتظام ہو۔ آر ٹی ای ایکٹ کے تحت اس بات کو لازمی قرار دیا گیا ہے کہ ہر بچہ اسکول میں تعلیم حاصل کرے، جس کا سیدھا سیدھا مطلب یہ بھی ہے کہ بچوں سے محنت مزدوری کرانے کی گھناؤنی کارروائی کا خاتمہ اب بہر صورت کرنا ہوگا۔

محنت سے متعلق محکموں کو بھی اپنی پالیسیوں کی تشکیل اس طرز پر کرنی چاہیے کہ آر ٹی آئی ایکٹ کے ساتھ ان کی پوری طرح مطابق ہو سکے، تاکہ اسکولوں کے تعلیمی عمل کا سبھی بچوں پر احاطہ کیا جا سکے۔ کمزور و پسماندہ طبقات کے لیے تعلیمی سہولیات کی فراہمی اس بات کی بھی متقاضی ہیں کہ اس سلسلے میں درج فہرست ذاتوں وقبائل اور تعلیمی طور پر پسماندہ اقلیتوں سے متعلق محکموں وتنظیموں کے درمیان بے حد سرگرم تعاون و اشتراک عمل میں آئے۔ خصوصی ضروریات رکھنے والے بچوں کے لیے ہمیں ایسے نظام قائم کرنے ہوں گے جہاں انھیں مساوی مواقع حاصل ہوسکیں، دیہی ترقیات اور پنچایتی راج کے محکموں کو بھی غریبی کے خاتمہ سے متعلق پروگراموں میں تیزی لانی ہوگی، تاکہ بچوں کو گھریلو کاموں اور پیسہ کمانے کی ذمے داری سے آزاد کیا جا سکے۔ ریاستی سرکاروں کو اس کے ساتھ ہی ساتھ اس بات کو یقینی بنانا ہوگا کہ اس سارے عمل میں پنچایتی راج اداروں کا بھی بھرپور تعاون حاصل رہے تاکہ ”مقامی حکام“ آر ٹی ای ایکٹ کے تحت اپنی ذمے داریاں بخوبی انجام دے سکیں۔ این سی پی سی آر/ ایس سی پی سی آر اور خواتین اور بہبود واطفال سے متعلق محکموں کے قریبی تعاون کی بھی اس سلسلے میں بیحد ضرورت ہوگی تاکہ بچوں کو آر ٹی ای ایکٹ کے تحت ان کے حقوق حاصل ہوسکیں۔ قومی رورل ہیلتھ مشن کو بھی کمزور طبقات اور خصوصی طور پر نو عمر بچیوں پر خصوصی توجہ کے ساتھ، پیٹ کے کیڑوں سے بچوں کو نجات دلانے اور انھیں تغذیہ بخش اضافی غذا مہیا کرانے کی غرض سے اسکولوں میں صحت کی دیکھ بھال سے متعلق پروگرام بھی شروع کرنے ہوں گے۔ کھیل کود سے متعلق محکموں کو بھی بچوں کی مجموعی جسمانی، سماجی، جذباتی و دماغی صلاحیتوں کے فروغ کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہی جسمانی تعلیم سے متعلق نظام کی تشکیل کرنی ہوگی۔ اس کے علاوہ، عوامی گروپوں، سول سوسائٹی تنظیموں اور رضا کار اداروں کو بھی آر ٹی ای کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں اہم رول ادا کرنا ہوگا۔ اس طرح ہمیں بچوں وبچیوں اور سماج کے سبھی طبقات کے تعاون پر مشتمل ایک نئے تناظر کی تشکیل میں مدد مل سکے گی اور اس بات کو بھی یقینی بنایا جا سکے گا کہ یہ سبھی پہلو، تربیت، نصاب اور کلاس روم کے تدریسی عمل کا ایک اہم و اٹوٹ حصہ بن جائیں۔ اس سلسلے میں ایک سرگرم سماجی تحریک بھی اس بات کو یقینی بنائے گی کہ بچوں کے حقوق کی خلاف ورزی نہ ہو اور اس طرح کمزور و پسماندہ طبقات کی آواز میں بھی قوت و استحکام پیدا ہو سکے گا۔

ان اقدامات کے ذریعے مقامی معلومات میں اضافہ وتکنیکی مہارت اور مستقبل کے چیلنجوں کے حل تلاش کرنے کی سمت میں نئے تجربات و خیالات کے ذریعے پروگراموں کو بہتر بنانے میں بھی مدد مل سکے گی۔ آر ٹی ای ایکٹ کی 86 ویں ایکٹ ترمیم کے تحت ہمیں وہ اوزار حاصل ہو گئے ہیں، جن کے ذریعے ہم سبھی بچوں کو معیاری تعلیم مہیا کرا سکتے ہیں۔

اب ہم سبھی ہندوستانی شہریوں کے لیے یہ ناگزیر ہو جاتا ہے کہ ہم اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ اس قانون کو اس کے صحیح تناظر میں عملی جامہ پہنایا جائے، ایک دوسرے کے تعاون اور اشتراک کے ساتھ بھر پور کوشش کریں۔ اگرچہ حکومت اس نصب العین کے حصول کے تئیں پوری طرح سے پر عزم ہے تاہم اصل تبدیلی و کامیابی سبھی افراد کے تعاون واشتراک کے ذریعے ہی ممکن ہو پائے گی۔

(بشکریہ روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی)

□□□

کرین ہولشوف

تعلیم کی جانب بڑھتے قدم

بنیادی تعلیم کے حق سے ہندوستان خوشحالی اور پیداواریت کی اعلیٰ ترین بلندیوں پر پہنچے گا

مفت اور لازمی تعلیم کے لیے بچوں کے حق (آرٹی ای) سے متعلق قانون کا نفاذ ہندوستان کے بچوں کے لیے ایک تاریخی لمحہ ہے۔ یہ قانون اس بات کو یقینی بنانے کے لیے ایک تعمیری جزو کا کام کرتا ہے کہ ہر ایک بچے کو ضمانت شدہ معیاری ابتدائی تعلیم کا حق ہے۔ کنبوں اور فرقوں کی مدد سے اس فرض کو پورا کرنا مملکت کی ایک قانونی ذمے داری ہے۔

تمام بچوں کو اپنی بھرپور صلاحیت کو فروغ دینے کے سلسلے میں مدد کرنے کے لیے مفت اور بچوں پر مرکوز نیز بچوں کے لیے سازگار تعلیم کو یقینی بنانے کے لیے دنیا کے چند ہی ملکوں میں اس طرح کا ایک قومی اہتمام کیا گیا ہے۔ چھ سال سے 14 سال تک کی عمر کے درمیان تقریباً آٹھ ملین بچے ایسے ہیں، جو اسکول نہیں جاتے ہیں۔ ہندوستان کے بغیر ''دنیا میلینیم کے اس ترقیاتی نشانے تک نہیں پہنچ سکتی۔ جب تک کہ 2015 تک ہر ایک بچہ پرائمری اسکول کی تعلیم مکمل کر لے۔

گذشتہ کچھ دہوں میں ہندوستان کے تعلیمی نظام کے سلسلے میں فوائد زبردست رہے ہیں۔ سب کے لیے تعلیم کے سلسلے میں ہندوستان کے وسط دہے کے جائزے کے مطابق 2000 اور 2005 کے درمیان محض پانچ برسوں میں، ملک میں پرائمری اسکولوں میں داخلوں میں مجموعی طور سے 13.7 فی صد اور لڑکیوں کے معاملے میں 19.8 فیصد کا اضافہ ہوا ہے، جس سے ہندوستان گریڈ 1 میں سب کے داخلوں کے قریب پہنچ گیا ہے۔

ان قابلِ تعریف کوششوں کے باوجود بھی، 2005 میں چار بچوں میں سے ایک بچے نے گریڈ پانچ میں اور تقریباً نصف تعداد نے گریڈ آٹھ میں پہنچنے سے پہلے ہی اسکولی تعلیم کا سلسلہ ترک کر دیا ہے۔ تعلیم حاصل کرنے کے جائزوں سے بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ بچے، جو اسکولی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں، خواندگی اور گنتی کی بنیادی چیزیں یا اپنی ہمہ جہت ترقی کے لیے ضروری اضافی معلومات اور ہنر نہیں سیکھ رہے ہیں، جیسا کہ آرٹی ای کے تحت وضاحت کی گئی ہے۔

آرٹی ای کے قانون محروم گروپوں، جیسے مزدور بچوں، نقلِ مکانی کرنے والے بچوں، خصوصی ضروریات والے بچوں یا ''سماجی، ثقافتی، معاشی، جغرافیائی، لسانی، صنفی یا ایسے دوسرے عناصر کی وجہ سے محروم'' بچوں کے لیے مخصوص اہتمام کے ساتھ، نظرانداز کردہ بچوں تک پہنچنے کے لیے ایک پختہ پلیٹ فارم فراہم کرتا ہے۔ کم ہوتی ہوئی عدم مساوات کے پیشِ نظر، ذاتی اسکولوں کو ان گروپوں سے تعلق رکھنے والے کم سے کم 25 فیصد بچوں کو داخلہ دینا چاہیے۔

'' تمام بچوں کو اپنی بھرپور صلاحیت کو فروغ دینے کے سلسلے میں مدد کرنے کے لیے مفت اور بچوں پر مرکوز نیز بچوں کے لیے سازگار تعلیم کو یقینی بنانے کے لیے دنیا کے چند ہی ملکوں میں اس طرح کا ایک قومی اہتمام کیا گیا ہے۔

قانون میں ممکنہ حد تک ڈر اور فکر سے آزاد کلاس روموں کو یقینی بنانے کے لیے جسمانی سزا پر پابندی لگا کر نیز مادری زبان کی تعلیم فراہم کر کے مساوات کے ساتھ معیار کے لیے کوشش کی گئی ہے۔ مزید برآں، آرٹی ای میں درس و تدریس کے معیار پر توجہ مرکوز کی گئی ہے، جس کے لیے تیز تر کوششوں اور کافی اصلاحات کی ضرورت ہے۔ بچوں کے لیے سازگار تعلیم کو یقینی بنانے کی غرض سے اگلے تین سے پانچ برسوں میں ایک ملین سے زیادہ نئے اور غیر تربیت یافتہ اساتذہ کو تربیت دینے نیز ملازم اساتذہ کے ہنر اور صلاحیت کو مستحکم بنانے کے لیے تخلیقی اور پائیدار اقدامات اہم ہیں۔

ہندوستان میں تقریباً 190 ملین لڑکیوں اور لڑکوں میں سے ہر ایک لڑکی اور لڑکے کے لیے، جنھیں آج ابتدائی اسکول میں ہونا چاہیے، بچوں کے لیے سازگار تعلیم کو یقینی بنانے کے سلسلے میں کنبوں اور فرقوں کا بھی ایک بڑا کردار ہے، جسے انھیں ادا کرنا ہے۔ اسکولوں کی منتظمہ کمیٹیوں میں مقامی حکام، اساتذہ اور خود بچوں کے ساتھ ساتھ، والدین کو بھی شامل کیا جائے گا۔ ان کمیٹیوں میں 50 فیصد خواتین اور محروم گروپوں سے تعلق رکھنے والے بچوں کے والدین کی شمولیت سے ماضی کی عدم

مساوات کو ختم کرنے میں بھی مدد ملنی چاہیے۔ ان کمیٹیوں کو اسکول کے ترقیاتی منصوبے تشکیل دینے نیز صفائی ستھرائی اور حفظانِ صحت کے طریقوں اور دوپہر کے کھانے کے انتظام سمیت، اسکول کے پورے ماحول کی نگرانی کرنے کے سلسلے میں مدد کی ضرورت ہوگی۔ ہمیں معلوم ہے کہ مناسب صفائی ستھرائی سے اسکولوں میں حاضری پر اثر پڑتا ہے۔ اسکولوں میں نجی اور علیحدہ صاف ستھرے بیت الخلاء فراہم کرنے سے لڑکیوں کے داخلوں میں 11 فیصد تک کا اضافہ ہوسکتا ہے۔

آر ٹی ای سے متعدد چیلنج بھی سامنے آتے ہیں۔ عدم مساوات کو ختم کرنے نیز مساوات کے ساتھ معیار کو یقینی بنانے کے سلسلے میں مسلسل کوششیں لازمی ہیں۔ مثال کے طور پر جیسا کہ قانون میں کہا گیا ہے، چھ سال کی عمر سے شروعات کرنا اسکول کے لیے تیار کرنے کے سلسلے میں بنیادیں رکھنے کے لیے کافی دیر ہوسکتی ہے۔ لہٰذا، جلدی تعلیم حاصل کرنے کے سلسلے میں سرمایہ کاری کرنا حدف پورا کرنے کے سلسلے میں ایک اہم حکمتِ عملی ہے۔ اس کے علاوہ اسکولوں میں برقرار رہنے کے سلسلے میں مدد کے ساتھ عمر کی مناسب سطح پر اسکول نہ جانے والے آٹھ ملین بچوں کو کلاسوں میں لانا نیز اس میں کامیاب ہونا ایک بڑا چیلنج ہے، جس کے لیے لچکدار اور اختراعی طریقوں کی ضرورت ہے۔ بہار اور اتر پردیش جیسی ریاستوں کو بھی، جہاں اسکول نہ جانے والے بچوں کی سب سے بڑی تعداد ہے، فرق کو ختم کرنے کے لیے ٹھوس مدد کی ضرورت ہوگی۔

اسی کے ساتھ ساتھ آر ٹی ای ایک عظیم موقع فراہم کرتا ہے۔ ماضی میں تعلیم کے شعبے میں ہندوستان کی حصولیابیوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے نشانوں تک پہنچنا ممکن ہے نیز آر ٹی ای نے ایک ایسا حدف مقرر کیا ہے، جو پورا کیا جاسکتا ہے۔ ہندوستان کے بچوں کے لیے تعلیم کے حق کے قانون کو حقیقت میں بدلنے کے سلسلے میں حکومت تمام فرقوں کے ساتھ ملکی اور ریاستی سطح پر مدد دینے کو تیار ہے اور اب اس میں یونیسیف بھی شامل ہو رہا ہے۔

آر ٹی ای کی وجہ سے ہندوستان اس بات کو یقینی بنانا چاہتا ہے کہ ملینیم کے ترقیاتی حدف کو حاصل کرنے کے سلسلے میں ایک عالمی رہنما کے طور پر ابھر سکتا ہے اگر تمام بچے 2015 تک پرائمری اسکول کی اپنی تعلیم مکمل کرلیں۔ یہ ایک چیلنج ہے، لیکن آر ٹی ای کے سلسلے میں پیش رفت کو فروغ دینے والے وسائل اور سیاسی عزم کی وجہ سے یہ ایک ناممکن کام نہیں ہے۔ دنیا کی نظریں ہندوستان پر ہیں، کیونکہ وہ عالمی سطح پر تعلیم کے شعبے میں اپنا صحیح قائدانہ کردار ادا کرنے کے سلسلے میں اپنے آپ کو تیار کررہا ہے۔ لاکھوں بچے مساوات کے ساتھ معیاری تعلیم کو یقینی بنانے والے اس قدم سے مستفید ہوں گے۔ آر ٹی ای تمام بچوں کو معیاری تعلیم کے ان کے حق اور ایک روشن تر مستقبل کی ضمانت دے کر، اس عظیم ملک کو خوشحالی اور پیداواریت کی اعلیٰ ترین بلندیوں تک پہنچائے گا۔

(بشکریہ ”ٹائمز آف انڈیا“، نئی دہلی)

□□□

مترجم: فرحت عثمانی

پتہ:
C-116, 4th Floor, Shaheen Bagh,
Abul Fazal Enclave,
Phase II, Okhla,
New Delhi-110025

اتحاد سے انتشار کی طرف

مصنف: پروفیسر مشیر الحسن

اودھ کی گم ہوتی ہوئی قصباتی تہذیب اس ہند ایرانی ثقافتی ورثے کی امین رہی ہے جو ہمارے صدیوں کے ثقافتی میل جول کی دین تھا۔

پروفیسر مشیر الحسن کی یہ کتاب جو ایک مورخ کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے مختلف مذہبی فرقوں کے ان باہمی تعلقات پر روشنی ڈالتی ہے جو کثرت میں وحدت کی آئینہ داری کرتے تھے۔ قصبات کی روزمرہ کی زندگی رسم و رواج، سماجی اور مذہبی تقریبات، ان سب چیزوں کا ایسا دانشورانہ بیان جو دلچسپ بھی ہے اور خیال انگیز بھی۔

صفحات: 415، قیمت: -/216 روپے

توقیر راہی

اردو کا مقام اور ذریعۂ تعلیم: آئین ہند کے تناظر میں

ہندوستان کی سب سے بڑی خوب صورتی یہ ہے کہ یہاں لسانی، ثقافتی اور تہذیبی کثرت کے باوجود ایک خوشنما وحدت (Unity in Diversity) ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو عالمی پیمانے پر ہندوستان کو دیگر ممالک سے منفرد وممتاز کرتی ہے۔

ہندوستان کے آئین میں دفعہ 29 اور 30 کے تحت یہاں کے مذہبی اور لسانی اقلیتوں کو اپنے مذہبی اور تعلیمی ادارے قائم کرنے اور اپنی زبان وثقافت کو فروغ دینے کا بھی پورا پورا حق دیا گیا ہے۔

جہاں تک دستور ہند میں اردو کی آئینی پوزیشن کا سوال ہے تو آئین کی دفعات 345اور 347 کے تحت اردو زبان کو تسلیم کرنے اور اسے فروغ دینے کی بات کہی گئی ہے۔ سہ لسانی فارمولے کے تحت بعض ریاستوں میں اردو تعلیم کا انتظام بھی ہے۔ اس حقیقت سے انکار بھی ممکن نہیں کہ سہ لسانی فارمولے پر آج مکمل طور پر عمل درآمد نہیں ہو رہا ہے، جس کی اشد ضرورت ہے۔ آج دنیا کے تمام ماہرین تعلیم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بچے کی ابتدائی تعلیم اس کی مادری زبان میں ہونی چاہیے کیونکہ مادری زبان کا رشتہ بچے کے ساتھ شکم مادری سے ہے۔ نیز یہ خون کا بھی رشتہ ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اردو میڈیم تعلیم کا سوال ٹیڑھی کھیر ہے کیونکہ کوئی بھی زبان اس وقت تک مکمل طور پر ترقی نہیں کرسکتی ہے جب تک کہ اس کو میڈیم کے طور پر نہ اپنایا جائے، خصوصاً تعلیمی اداروں میں۔ لیکن اردو میڈیم تعلیمی اداروں پر نگاہ ڈالنے سے بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ بعض ریاستوں میں پرائمری، ثانوی اور اعلیٰ درجوں میں اردو تعلیم کا انتظام ہے۔ یہاں خصوصیت کے ساتھ آندھرا پردیش، مہاراشٹر، مغربی بنگال اور بہار کا نام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسی ریاستوں میں بھی مایوسی اس وقت دامن گیر ہوتی ہے جب طلبہ کو بروقت اردو درسی کتب دستیاب نہیں ہوتیں۔ اردو تعلیم کے تعلق سے اترپردیش کی موجودہ صورت حال نہایت ہی مایوس کن ہے۔ ایک جائزے کے مطابق پرائمری سطح پر سرکاری اردو میڈیم اسکولوں کی تعداد صفر کے برابر ہے۔ دہلی میں اردو میڈیم تعلیمی اداروں کی شکل وصورت ہماری آنکھوں سے اوجھل نہیں۔ اس حقیقت کا اندازہ امتحان بورڈ کے نتائج سے لگایا جا سکتا ہے۔ مزید برآں اگر انگریزی میڈیم اور اردو میڈیم تعلیمی اداروں کا ایک تقابلی مطالعہ کیا جائے تو حقیقت کا انکشاف روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گا۔

آج کا دور سائنس، ٹیکنالوجی اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کا ہے۔ اور ان کورسیز کی کتابیں انگریزی میں دستیاب ہیں۔ لہٰذا موجودہ وقت کی ضرورت ہے کہ متذکرہ پیشہ ورانہ کتب کے اردو میں ترجمے کیے جائیں۔ اس عظیم خدمت کو انجام دینے کے لیے قومی اردو کونسل اقدامات کر رہی ہے۔ اس جانب مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے بھی قدم اٹھایا ہے، خواہ دھیمی رفتار ہی سہی۔ قومی اردو کونسل نے پیشہ ورانہ (IT) کورسیز کی 18 کتابیں اردو میں ترجمہ کرا کے شائع کی ہیں۔ اور مزید متعلقہ کورسیز کی کتابیں ترجمے کے مرحلے سے گزر رہی ہیں۔

قومی اردو کونسل نے اردو تعلیم کے تعلق سے جو اہم انقلابی خدمات انجام دی ہیں، اس کا علم اردو دنیا کو بخوبی ہے۔ یہ این سی پی یو ایل (NCPUL) ہی ہے جس نے اردو کو انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ساتھ پرواز کرنے کے لیے بازو اور پر فراہم کیے ہیں۔ آج کا عہد فاصلاتی تعلیم (Distance Education) کا عہد بھی کہا جاتا ہے۔ قومی اردو کونسل نے اردو سکھانے کے لیے فاصلاتی تعلیم کا کورس بھی چلا رکھا ہے، جس میں مذہب وملت کی تفریق کے بغیر نیز عمر کی قید و بند سے آزادی دیتے ہوئے ہر قسم کے افراد بشمول خواتین کا داخلہ جاری ہے۔ اس میں ریٹائرڈ عملہ اور افسران بھی شامل ہیں۔

یوں تو آئین ہند میں اردو کی پوزیشن تحریری طور پر بڑی مستحکم نظر آتی ہے، لیکن اس پر کتنا عمل ہو رہا ہے، یہ قابل غور ہے۔ بہت ساری جگہوں پر اردو میڈیم تعلیم کا نظم ونسق موجود ہے لیکن دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اس کا معیار کس سطح کا ہے۔ اردو تعلیم وتعلم میں طلبا و اساتذہ کا اضافہ ہو رہا ہے یا کمی؟ اسی طرح اردو قارئین کی تعداد گھٹ رہی ہے یا بڑھ رہی ہے؟ اردو میڈیم اسکولوں، کالجیز کے قیام میں اضافہ ہو رہا ہے یا نہیں؟ کیا اردو میڈیم تعلیم کی خدمات غیرشعوری طور پر دینی مکاتب و مدارس انجام دے رہے ہیں؟

سچر کمیٹی کی رپورٹ میں بھی اردو کے فروغ کی وکالت کی گئی ہے لیکن اصل مسئلہ عملی جامہ پہنانے کا ہے۔ اسی طرح سردار جعفری اور

گجرال کمیٹی کی رپورٹ سے بھی ہم خوب آشنا ہیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ کسی کام کو التوا میں ڈالنے کے لیے کمیٹی و کمیشن کا سہارا لیا جاتا ہے اور پھر سرد مہری کے لیے سرد بستہ کا قفل لگا دیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی اردو کے تعلق سے سیمینار، ورکشاپ اور کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں لیکن نتائج کیا برآمد ہوتے ہیں اور لائحہ عمل کیا تیار ہوتا ہے؟

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند کی جانب سے ایک نوڈل ایجنسی کی حیثیت سے اردو زبان کی ترویج و ترقی کے لیے اہم اقدامات کر رہی ہے۔ وزارت ترقی انسانی وسائل کے اردو سے متعلق حلقوں میں اب شدت کے ساتھ یہ بات محسوس کی جا رہی ہے کہ اردو کے فروغ کے لیے ایک نئے وژن (vision) اور ایک نئی حکمت عملی بنائی جائے تاکہ اردو اور اردو کلچر سے وابستہ تمام فنون لطیفہ مثلاً خطاطی، مصوری، پینٹنگ، غزل گائکی، Architecture، سنگ تراشی وغیرہ ورثے کو محفوظ کیا جائے۔ اس تعلق سے قومی اردو کونسل کو ایک اپروچ پیپر (Approach Paper) تیار کرنے کے لیے کہا گیا ہے تاکہ اردو کو نئے تقاضوں وضرورتوں کے مطابق فروغ دیا جائے۔ 12/ مارچ 2010 کو اس سلسلے میں کونسل نے انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر، نئی دہلی میں ''راؤنڈ ٹیبل'' (Round Table) کا انعقاد کیا جس میں ملک کے اردو دانشوروں کو مدعو کیا گیا تاکہ مذاکرات کے ذریعے اردو زبان و ادب اور کلچر کا ایک روڈ میپ (Roadmap) تیار کیا جا سکے۔ مذکورہ راؤنڈ ٹیبل نئے منصوبے اور ایکشن پلان بنانے میں معاون و مددگار ثابت ہوگا۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ راؤنڈ ٹیبل کی یہ پہلی کڑی ہے۔ اس طرح کے مزید مذاکرات قومی اردو کونسل دوسرے شہروں مثلاً لکھنؤ، ممبئی اور پٹنہ میں بھی منعقد کرنے کا ارادہ رکھتی ہے تاکہ اردو کی نئی حکمت عملی اور نئی پالیسی کا ایک جامع خاکہ تیار کیا جا سکے۔ اردو زبان اور اس کے تعلیمی و تدریسی مسائل کو حل کرنے کی سمت میں حکومت کے نئے وژن کی بات، اور اپروچ پیپر تیار کرنے کی مہم ایک انقلابی قدم ہے۔ جس سے اس عظیم زبان کا مستقبل متعین ہوگا اور اسے اس کی وہ حیثیت واپس دلائی جا سکے گی جو فی الوقت سنہرے ماضی کی یادوں کی صورت میں باقی ہے۔

یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ کوئی بھی زبان اپنے قارئین اور بولنے والوں کی طاقت پر زندہ رہتی ہے۔ اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ کسی بھی شعبہ میں ترقی کے لیے حکومت کی پشت پناہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے ملک کا ڈھانچہ جمہوریت کے عظیم ستون پر کھڑا ہے، لہٰذا اردو کی بقا اور فروغ کے لیے جمہوری طور طریقے اور عملی انداز اپنانے ہوں گے اور اس کا آغاز پہلے خود سے کرنا ہوگا پھر اہل دعیال سے، بعد ازاں عوام الناس اور حکومت سے۔ اس نقطۂ نظر سے ہم کتنا کھرا اتر رہے ہیں، یہ جاننے کے لیے خود کے نہاں خانوں میں جھانکنے کی ضرورت ہے۔

ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ ہم تمام مکتبۂ فکر والے اپنے اپنے طور پر علاقائی ضرورتوں اور تقاضے کو سامنے رکھتے ہوئے ایک لائحہ عمل تیار کریں نیز اس بات کا حلف لیں کہ ہم اردو کی ترویج و اشاعت کا باعث بنیں گے اور اردو کی بقا و فروغ کی جدوجہد کا اولین قدم خود سے اٹھائیں گے۔ علاوہ ازیں ریاستی اردو اکیڈمیوں کے ساتھ مل بیٹھ کر اردو کے کاز کے لیے اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔ یہاں حکومت سے یہ بھی مانگ کرنے کی ضرورت ہے کہ حکومت تمام انگریزی میڈیم اسکول، کندریہ ودیالیہ، نودے ودیالیہ، سرودے ودیالیہ اور سرکاری نیز پرائیوٹ اسکولوں میں اردو تعلیم کا انتظام و انصرام کرے کیونکہ اردو تعلیم کی عدم موجودگی کے باعث طلبہ کو ایسے تعلیمی اداروں میں بہ حالت مجبوری دیگر مضمون کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ 2011 کے لیے مردم شماری کا آغاز ہو چکا ہے اور یہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ یہ مردم شماری بڑی تفصیلات پر مبنی ہے۔ اس تعلق سے ہمارا قومی اور ثقافتی فریضہ ہے کہ ہم اپنی مادری زبان 'اردو' ضرور درج کرائیں اور دوسروں کو بھی اس بات کی ترغیب دیں۔ چونکہ حکومت کی پالیسیوں کا لائحہ عمل مستقبل میں اسی مردم شماری کی بنا پر تیار ہونے والا ہے۔ اگر ہم نے ذرا سی بھی تساہلی اور کوتاہی برتی تو مستقبل قریب میں اپنی ثقافتی اور لسانی اقدار سے محروی بھی ہو سکتی ہے۔ یاد رہے کہ ذرا سی غفلت ہمیں بہت بڑے خسارے کی طرف ڈھکیل سکتی ہے۔ آج حکومت اگر ہماری ثقافتی اور لسانی شناخت کو محفوظ کرنا چاہتی ہے تو ہم حکومت کے اس پروگرام میں شامل ہو کر حکومت کا بھرپور تعاون کریں۔ اس طرح متذکرہ مردم شماری میں خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ یہ مستقبل میں اردو اور اردو والوں کو ان کا جائز حق دلانے اور نئی پالیسی بنانے میں معاون ثابت ہو سکے۔

جس ملک کا اولین وزیر اعظم اردو سے آشنا ہو اور موجودہ وزیر اعظم نہ صرف اردو داں بلکہ اردو کا دلدادہ بھی، نیز جس سیکولر ملک کے پہلے وزیر تعلیم کی ''لوح و قلم'' اردو ہو، اس ملک میں اردو کی زبوں حالی ہم سبھی کے لیے لمحۂ فکریہ ہے اور اس کی متقاضی بھی کہ ہم اس شاندار زبان اور اس سے وابستہ ثقافت کو قائم و دائم رکھنے کی کوشش میں کوئی کسر نہ چھوڑیں۔

□□□

پتہ:
F-176, 2nd Floor, Abul Fazal, Part-II
Jamia Nagar, New Delhi-25

حسن رضا

فاصلاتی تعلیم: اگنو، مانو اور مظفر پور!

علم سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا ہے۔ یہ قدیم اور مجرب مقولہ مبتدیوں اور نو آموزوں پر صادق آتا ہے، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے مصلوں پر نہیں، نئی تعلیمی تکنیک، نئے طریقۂ تعلیم اور برقی مصنوعات کی جدید ترین ایجادات نے فاصلاتی تعلیم کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ روایتی تعلیم کے ساتھ ساتھ تکنیکی تعلیم کو بھی اسٹڈی سنٹرز کے توسط اور کاؤنسلرز کے تعاون سے یقینی بنا دیا ہے۔ سرعت سے بڑھتی ہوئی آبادی، آبادی کے تناسب میں تعلیمی اداروں کے فقدان، تعلیم ترک کر کے روزی روزگار سے وابستہ ہونے کی مجبوری، تکنیکی تعلیم کی گراں باری وغیرہ نے محکمۂ تعلیم اور شعبۂ نفسیات کے ذمے داروں اور ماہروں کو فاصلاتی تعلیم کا لائحہ عمل تیار کرنے کی جانب متوجہ کیا۔ اس سمت اپنے ملک میں پہلا باضابطہ قدم اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی (IGNOU) نے اٹھایا اور ایک ایسا نصاب تعلیم مرتب کیا جس نے طلبہ وطالبات کو مطالعہ اور تجربہ دونوں عمل کے لیے متحرک کیا۔ یونیورسٹی مذکور نے اولاً طالب علموں کو وافر مواد فراہم کیا اور ساتھ میں نمونے کے سوالات روانہ کیے تاکہ طلبہ تلاش وتحقیق کر کے جوابات کی ترتیب و تدوین کی مشق کریں اور ان جوابات کی دریافت میں Assignment کے سوالات آنے تک اچھی خاصی اہلیت و استعداد حاصل کر لیں۔ اس کے علاوہ From known to unknown کے طرز پر مزید معلومات و دریافت کے لیے متحرک کیا۔ اس طرح مطالعہ وتجربہ اور تلاش وتحقیق کے Method نے فاصلاتی تعلیم کو پر اثر اور کارآمد بنا دیا۔

IGNOU کا مذکورہ طرز تعلیم ان طلبہ وطالبات کے لیے باعث پریشانی تھا جنھوں نے نہ صرف تعلیم سے قطع تعلق کر رکھا تھا بلکہ وہ تجارت، نوکری، پیشہ وغیرہ میں بھی مصروف تھے۔ اس مسئلہ کا حل مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (MANUU)، حیدرآباد نے تلاش کیا۔ اس نے IGNOU کے نصاب سے کسب فیض کرتے ہوئے اردو ذریعۂ تعلیم پر مشتمل ایک ایسا نصاب مرتب کیا جس کے سوالوں کے جوابات کے لیے بھٹکنا نہ پڑے۔ لہٰذا سارے سوالوں کے جواب اسباق میں ہی یکجا کر دیے گئے۔ یہی نہیں، نمونے کے سوال و جواب بھی نصاب میں شامل کیے گئے۔ اس سے اوسط شعور کا حامل شخص بھی بہ آسانی Assignment تیار کرنے کے قابل ہو گیا اور نمونے کے سوالوں کے جوابات خود تیار کر کے امتحان دینے اور کامیابی حاصل کرنے کی استعداد بھی پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

طرز تعلیم کی اسی تسہیل کاری نے عام طلبہ و طالبات کو حصول تعلیم کی جانب راغب کیا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج پورے ہندوستان میں MANUU کے سو سے زیادہ اسٹڈی سنٹرز قائم ہو چکے ہیں اور اعلیٰ تعلیم سے محروم لاکھوں لوگ دوبارہ تعلیم اور تعلیمی مراکز سے منسلک ہو گئے ہیں۔ صرف مظفر پور اسٹڈی سینٹر میں ہی MANUU کے مختلف کورسیز میں ہزاروں طالب علم زیر تعلیم ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ بابا صاحب بھیم راؤ امبیڈکر بہار یونیورسٹی کے P.G. Deptt. (اردو) میں بھی اتنے طلبہ نہیں ہیں، جتنے کہ ایم۔ اے اردو میں مذکورہ اسٹڈی سنٹر میں رجسٹرڈ ہیں۔

فاصلاتی تعلیم اور ادارہ جاتی تعلیم کے بین بین تعلیم کا ایک نیا فارمیٹ Campus Course بھی بے حد مقبول ہو رہا ہے۔ سب کی بساط کے باہر ہے کہ دور دراز کی یونیورسٹیوں میں جا کر تکنیکی تعلیم حاصل کرے، مگر کیمپس کورس کے لیے اگر آس پاس کے شہروں میں بھی اسٹڈی سنٹرز ہوں تو یہ عام لوگوں کی دسترس میں ہوتا ہے۔ لہٰذا آج کئی صوبوں کی یونیورسٹیاں مختلف شہروں میں اپنے اپنے اسٹڈی سنٹرز قائم کر رہی ہیں۔ اس ضمن میں سکم منی پال یونیورسٹی، مہاتما گاندھی انتر راشٹریہ ہندی وشودیالیہ (وردھا)، اناملائی یونیورسٹی (آندھرا پردیش) کے نام

خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ وردھا کی مذکورہ یونیورسٹی B.B.A اور M.B.A کا کیمپس کورس کراتی ہے جس کا اسٹڈی سنٹر مظفر پور میں گزشتہ 2009 سے چل رہا ہے۔ انا ملائی یونیورسٹی نے NIFS (National Institute of Fire Security) کے مختلف کورسیز کے لیے بھی مظفر پور میں اسٹڈی سنٹر قائم کیا ہے۔ یہ اسٹڈی سنٹرز ایک قسم کی شاخ یونیورسٹی ہی کی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان اسٹڈی سنٹرز نے کم استطاعت رکھنے والے لوگوں کو بھی متوجہ و متحرک کیا ہے۔

فروغ انسانی وسائل (HRD) نے بھی اسی نوع کا اسٹڈی سنٹر برائے کمپیوٹر اپلیکیشن کا قیام ملک کے کئی شہروں میں کیا ہے تا کہ اردو زبان والے بھی کمپیوٹر کو Operate کرنے کی اہلیت پیدا کرسکیں۔ مظفر پور میں بھی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (NCPUL) نے مذکورہ اسٹڈی سنٹر قائم کیا ہے جہاں سے 30 لڑکیاں سالانہ کمپیوٹر کورس کر رہی ہیں۔ غیر اردو داں لڑکے و لڑکیاں بھی یہ کورس کر رہی ہیں اور ساتھ میں اردو بھی سیکھ رہی ہیں۔ اس سے لسانی تعصب کا ازالہ بھی ہوگا اور نوجوان خود کفیل بھی ہوں گے نیز بے روزگاری کا بھی تدارک ہوگا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو بھی چاہیے کہ وہ پورے ہندوستان میں تکنیکی تعلیم کو عام کرنے کے لیے ہر شہر میں اسٹڈی سنٹرز قائم کرے جس کا ذریعۂ تعلیم اردو اور انگریزی دونوں ہوں۔ اس سے اردو بھی Job Oriental زبان بن کر مقبول عام ہوگی۔ ساتھ ہی مسلمانوں اور غیر اردو داں طبقہ کے درمیان روایتی تعلیم کے فروغ کے لیے بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو فاصلاتی تعلیمی مراکز قائم کرنا چاہیے جہاں ابتدائی اور ثانوی درجوں کے کورسیز کی تعلیم اردو میڈیم سے دی جائے تا کہ NCPUL اور MANUU کو Feed Back مل سکے اور Drop Out کا مسئلہ بھی حل ہو سکے۔ عموماً پسماندہ ریاستوں کی زیادہ تر لڑکیاں بمشکل میٹرک یا سکنڈری امتحانات کے بعد مذہبی پابندی، معاشی تنگی یا پھر شادی کی رخنہ اندازی کی وجہ سے تعلیمی سلسلہ منقطع کر لیتی تھیں، مگر اب ان کی ان مجبوری اور بے بسی کا فاصلاتی تعلیمی مرکزوں نے ایک حد تک قلع قمع کر دیا ہے۔ اب وہ میکے یا سسرال میں رہ کر بھی تکنیکی اور اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ ایسے لڑکے بھی ان مرکزوں سے فیض یاب ہو رہے ہیں جو خانگی ضرورتوں کی خاطر میٹرک وغیرہ کے بعد کلرک یا چپراسی وغیرہ کی نوکری سے وابستہ ہو گئے تھے۔ اب وہ بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنے محکمہ میں بھی Promotion پا رہے ہیں یا پھر مقابلہ جاتی امتحانات میں شامل ہو کر اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو رہے ہیں اسی طرح تدریسی خدمات میں Teacher's Training کا کورس کر کے معروف اساتذہ و استانیوں کو بھی یہ فاصلاتی تعلیمی مراکز اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے پرنسپل بننے کے مواقع فراہم کر رہے ہیں۔ حتیٰ کے بی۔ایڈ، ایم۔ایڈ اور پی۔ایچ۔ڈی بھی فاصلاتی نظام تعلیم سے کرنا ممکن ہو گیا ہے۔

بہار جیسے تعلیمی محاذ پر پسماندہ ترین صوبہ کے لیے پرائمری تعلیم کے بعد لڑکے اور لڑکیوں کا Drop Out ایک سنگین مسئلہ ہے۔ مالی اور سماجی پسماندگی بھی حصول تعلیم میں رخنہ انداز ہوتی ہے اور مویشیوں کی چرواہی، کھیتی باڑی کے کاموں اور گھریلو کاروبار میں ہاتھ بٹانے کی خاطر بھی انھیں Drop Out کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ اس لیے ایسے فاصلاتی تعلیمی مراکز کی داغ بیل ڈالنی ہوگی جہاں سے یہ Dropped Out لڑکے اور لڑکیاں درجہ نہم تا +2 (Intermediate) کی تعلیم گھریلو اور معاشی معروفیت کے باوجود حاصل کرسکیں۔ اس کے لیے AMU,MANUU اور NCPUL کو پہل کرنی چاہیے۔ ابتدا میں ایسے فاصلاتی تعلیمی مراکز ضلعی سطح پر قائم ہوں اور بعد میں اس کا Extention یعنی توسیع بلاک سطح پر کی جائے۔ اس سے اعلیٰ تعلیمی مراکز کو Feed Back ملے گا اور تعلیم کا تسلسل بھی برقرار رہے گا۔

اس مختصر سے جائزہ کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ فاصلاتی تعلیمی نظام نے دنیائے تعلیم و تدریس میں ایک تعمیری اور مثبت انقلاب برپا کر دیا ہے۔ یہ طریقۂ تعلیم ایک نعمتِ بے بہا ہے اور تعلیمی اعتبار سے نا آسودہ کثیر آبادی والے ہندوستان کے لیے کسی من وسلویٰ سے کم نہیں۔

□□□

پتہ:
Maripur, Road No. 2
Muzaffarpur, (Bihar)
Pin. 842001

شمس کمال انجم

اردو میں مستعمل عربی الفاظ و اصطلاحات

دنیا میں بے شمار زبانیں پائی جاتی ہیں۔ ہر زبان کے اندر دوسری زبان کے الفاظ و اثرات قبول کرنے کی فطری صلاحیت موجود ہے۔ عربی زبان ایک بین الاقوامی زبان ہے۔ کبھی اس نے کسی زبان کا اثر قبول کیا تو کبھی دیگر زبانوں پر اس کے اثرات مرتب ہوئے۔ جن زبانوں پر عربی زبان اثرانداز ہوئی یا جنھوں نے عربی کا اثر قبول کیا ان میں ہماری مادری زبان اردو سر فہرست ہے۔ ایک جائزے کے مطابق اردو زبان میں کل ساٹھ سے ستر ہزار عربی الفاظ پائے جاتے ہیں، ان میں کچھ نادر الاستعمال ہیں تو کچھ متوسط الاستعمال اور بہت سارے کثیر الاستعمال۔ اسلامی اور دینی موضوعات کی کتابوں میں چالیس سے پینتالیس فیصد، صحافتی مضامین میں تیس فیصد اور ادبی اصناف سخن میں پندرہ سے بیس فیصد عربی الفاظ بہ کثرت استعمال ہوتے ہیں۔ عربی سے ماخوذ الفاظ کو اردو لغات پورے اہتمام کے ساتھ ذکر کرتی ہیں۔ عربی الفاظ کے علاوہ اصطلاحات کی تشریح و توضیح کا بھی اردو لغات نے کافی اہتمام کیا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ بہت ساری اصطلاحات کا ذکر بغیر تحقیق کیے ہوئے کردینا کافی سمجھا جس کی وجہ سے بعض اصطلاحات کی تشریح دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔

اس وقت میرے سامنے مشہور لغت ''فیروز اللغات'' ہے جسے مولوی فیروز الدین نے ترتیب دیا ہے۔ اس مضمون میں میں نے اس کے اضافہ شدہ جامع ایڈیشن کو بنیاد بنایا ہے جس میں بے شمار عربی اصطلاحات کا اندراج کیا گیا ہے۔ گذشتہ دنوں ''اردو میں عربی الفاظ ایک جائزہ'' کے موضوع پر کام کرتے ہوئے اردو کی دیگر لغات کے ساتھ فیروز اللغات بھی میرے مطالعے میں رہی۔ اس دوران اس میں موجود اغلاط کو دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ ذیل میں عربی اصطلاحات وتراکیب پر نظر ڈالتے ہیں:

ابرہہ، یمن کا حبشی گورنر جس نے چھٹی صدی عیسوی کے نصف اول میں ہاتھیوں کے لشکر سے خانۂ کعبہ پر حملہ کیا تھا لیکن ابابیلوں کے کنکر پھینکنے سے اس کی ساری فوج ختم ہوگئی۔ یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے کچھ عرصہ پہلے ہوا۔ اصحاب فیل یعنی ہاتھی والے، ابرہہ شاہ یمن اور اس کا لشکر جو ہاتھیوں پر چڑھ کر خانہ کعبہ ڈھانے آیا تھا اور جن کو خدا کے حکم سے پرندوں نے کنکر مار مار کر تباہ و برباد کردیا تھا۔

صحیح: ابرہہ نے اولاتو خانۂ کعبہ پر حملہ نہیں کیا تھا بلکہ مکہ کے حصار کے وقت ہی اس کا لشکر تباہ ہوگیا تھا اور وہ خانۂ کعبہ پر حملہ نہیں کرسکا تھا۔ دوسرے، واقعہ چھٹی صدی عیسوی کے نصف اول کا نہیں بلکہ نصف ثانی کا ہے۔ بلکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے صرف پچاس یا پچپن دن پہلے ماہ محرم میں پیش آیا یعنی 671 کی فروری کے اواخر یا مارچ کے اوائل کا واقعہ ہے۔ کیونکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اسی سال 671 کے 20 یا 22 اپریل کو پیدا ہوئے۔ (الرحیق المختوم ص 78، 83)

احرام باندھنا: حرم میں جانے کی شرطیں بجا لانا، خانۂ کعبہ کے قریب پہنچ کر بعض حلال اور مباح چیزوں کو اپنے اوپر حرام کرلینا، بغیر سلا کپڑا پہننا جب کہ احرام باندھنے کا مطلب صرف خانۂ کعبہ کے قریب پہنچ کر بعض حلال اور مباح چیزوں کو اپنے اوپر حرام کرلینا نہیں ہے بلکہ میقات سے حج یا عمرے کی نیت سے احرام باندھنے سے لے کر اسے کھولنے تک اس پر بہت ساری چیزیں حرام ہوجاتی ہیں۔

اصحاب صفہ: صحابۂ کرام کا ایک گروہ جو ہر وقت عبادت الٰہی میں مصروف رہتا تھا، حضرت بلال، حضرت سلمان، حضرت ابوذر غفاری اور حضرت زید ابن الخطاب اسی گروہ میں سے تھے۔ اصحاب فیل کے معنی ہاتھی والے تو بتایا مگر یہاں اصحاب صفہ کی صراحت نہیں کی۔ اصحاب صفہ سے مراد صحابۂ کرام کا وہ گروہ نہیں تھا جو ہر وقت عبادت میں مشغول رہتا تھا بلکہ اصحاب صفہ وہ نادار اور غریب صحابہ تھے جن کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی میں ٹھہرایا اور انھیں اصحاب صفہ کا نام دیا۔

یہ لوگ آپؐ کے گھر کے شمال میں بنے ہوئے ملے یعنی چبوترے پر رہتے، عبادت کے ساتھ ساتھ اللہ کے رسولؐ سے علم سیکھتے۔ صرف حضرت بلال، حضرت سلمان، حضرت ابوذر غفاری اور حضرت زید ابن الخطاب اس گروہ سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ اور بھی صحابہ تھے جن میں حضرت ابوہریرہ کا نام نامی سرفہرست آتا ہے جسے مولف نے ترک کردیا ہے۔ ان کی تعداد ستر تک پہنچ گئی تھی۔

کہف کے معنی غار لکھنے کے بعد کہتے ہیں ''وہ کھوہ جس میں اصحاف کہف جاکر سوئے تھے، اس کے بعد اصحاب کہف کے معنی (صاحبان غار) بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں'' مسلمانوں کے عقیدے میں پانچ یا سات یا نو آدمی جو ہزاروں سال سے کہف یعنی غار میں سو رہے ہیں، اور قیامت کے دن اٹھائے جائیں گے، ان کے ساتھ ایک کتا بھی ہے۔'' حالانکہ کہف کا لفظی معنی صرف غار ہوتا ہے۔ نہ کہ وہ کھوہ جس میں اصحاف کہف جاکر سوئے تھے۔ ان کی تعداد بھی پانچ یا نو نہیں تھی بلکہ وہ قرآن مجید کے مطابق صرف سات آدمی تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔ سبعتہ وثامنھم کلبھم۔ ابن عباس نے اس کی تائید کی ہے۔ خود قرآن مجید نے رجما بالغیب کہہ کر پہلی دو تعداد ثلاثتہ رابعھم کلبھم، خمستہ سادسھم کلبھم کی تردید کردی ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ وہ ہزاروں سال سے کہف یعنی غار میں سو رہے ہیں، بلکہ قرآن مجید کے مطابق وہ صرف تین سو نو سال غار میں سوئے رہے۔ (ولبثوا فی کھفھم ثلاث مائۃ سنین وازدادوا تسعا) اس کے بعد ان کا انتقال ہوگیا اور اب وہ قیامت کے دن اٹھائے جائیں گے۔

حجر اسود: خانہ کعبہ کی دیوار میں نصب سیاہ پتھر جسے حاجی بوسہ دیتے ہیں۔ جب کہ حجر اسود کو صرف حاجی بوسہ نہیں دیتے بلکہ عمرہ کرنے والا یا غیر حاجی بھی بوسہ دے سکتا ہے۔

عشرۂ کاملہ: حاجیوں کے دس روزے جو قربانی دینے کی استطاعت نہ رکھنے والے تین حج سے پہلے اور سات اس کے بعد رکھتے ہیں۔ عشرۂ کاملہ کا یہاں نہ تو لفظی ترجمہ بتایا نہ ہی یہ اشارہ کیا کہ وہ قرآن مجید کی آیت کریمہ (فمن لم یجد فصیام ثلاثتہ ایام فی الحج وسبعتہ اذا رجعتم تلک عشرۃ کاملتہ) کا ٹکڑا ہے۔ نہ ہی اس سے مراد حاجیوں کے دس روزے ہیں بلکہ اس سے مراد حج تمتع کرنے والے ان حاجیوں کے دس روزے ہیں جنھیں قربانی کی طاقت نہ رکھنے کی صورت میں تین، ایام حج میں اور سات، گھر میں روزے رکھنے ہوں گے جو کہ عشرۃ کاملہ یعنی پورے دس ہو جائیں گے اور یہی ان کا فدیہ ہے۔

طیبہ: پاک، پوتر، مدینہ منورہ کو بھی کہتے ہیں۔ طیبہ کا لفظی معنی پاک پوتر درست ہے مگر یہ مدینہ منورہ کے ناموں میں سے ایک نام نہیں بلکہ یہ مدینہ کی صفت کے طور پر طیب کی موئث طیبہ استعمال ہوتا ہے۔ البتہ طیبہ ضرور مدینہ منورہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔

صفا مروہ: صفا: مکہ شریف کی ایک پہاڑی جہاں دوڑنا ارکان حج میں داخل ہے۔

مروہ: مکہ معظمہ میں ایک پہاڑی کا نام

تصحیح: صفا مروہ کے بیان کردہ دونوں مفہوم محل نظر ہیں۔ ثانیا یہ کہ اگر صفا مکہ کی ایک پہاڑی ہے جہاں دوڑنا ارکان حج میں داخل ہے تو انھیں مروہ کے بارے میں بھی یہی کہنا چاہیے کہ مروہ بھی اس دوڑ کا حصہ ہے۔ ثالثا یہ کہ صفا پر نہیں دوڑنا ہے بلکہ صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا ہے۔ رابعا یہ کہ سعی اور دوڑ صرف ارکان حج میں داخل نہیں ہے بلکہ عمرہ کرنے کے والے کے لیے سعی عمرہ کے ارکان میں شامل ہے۔ اگر وہ یوں کہتے تو شاید کافی ہوتا کہ صفا اور مروہ مکہ شریف کی دو پہاڑیاں ہیں جہاں پانی کی تلاش میں مائی ہاجرہ دوڑی تھیں اور اب صفا سے مروہ کے درمیان دوڑنا اور سعی کرنا ارکان حج و عمرہ میں داخل ہے۔ جب کہ صفا دراصل صفاۃ کی جمع ہے، اس کا معنی ہے چکنا اور چوڑا پتھر، اس سے مراد مسجد حرام کے جنوب میں واقع جبل ابوقبیس میں چھ میٹر لمبی، تین میٹر چوڑی اور دو میٹر اونچی جگہ کا نام ہے۔ جب کہ مروہ مرو کا واحد ہے۔ اس کا معنی ہے سفید پتھر۔ یہ مسجد حرام کے شمال مشرق میں واقع جبل قیقعان میں چار میٹر لمبی، دو میٹر چوڑی اور دو میٹر اونچی جگہ کا نام ہے۔ (دیکھیے الموسوعہ الحرۃ کیپیڈیا) ان دونوں کے درمیان سات سو ساٹھ ہاتھ کی مسافت ہے۔ (ایسر التفاسیر للجزائری 135/1)

عرفات: مکہ سے بارہ میل کے فاصلے پر ایک مقدس میدان جہاں حاجی حج کے دن کھڑے ہو کر لبیک پکارتے ہیں، یہاں کچھ عرصہ قیام ہی حج ہے۔

صحیح: میدان عرفات میں حاجی صرف لبیک نہیں پکارتے بلکہ لبیک کے ساتھ نماز اور دیگر ارکان میں بھی مشغول رہتے ہیں۔

عمرہ: زمانۂ حج کے علاوہ مکہ معظمہ کی حاضری اور بیت اللہ کا طواف

اس میں حج کی طرح ہی احرام باندھا جاتا اور بیت اللہ کے طواف اور صفا ومروہ کے درمیان دوڑنے کے بعد احرام کھول دیتے ہیں پھر اس کے بعد آٹھ ذی الحجہ کو دوبارہ احرام باندھتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا کہ عمرہ زمانۂ حج کے علاوہ مکہ معظمہ کی حاضری اور طواف کا نام ہے محل نظر ہے۔

لبیک: حاضر ہوں، موجود ہوں، حاجی لوگ میدان عرفات میں بار بار یہ کلمہ کہتے ہیں

صحیح: حاجی صاحبان لبیک صرف میدان عرفات میں نہیں پکارتے بلکہ میقات سے احرام کی نیت لبیک ہی سے کی جاتی ہے اس کے بعد مستقل اس کا ورد حاجی کے لیے مستحب ہے۔

مشعرالحرام: مکہ معظمہ میں وہ جگہ جہاں پر ایام حج میں قربانی کرتے، سر منڈاتے اور عبادت کرتے ہیں۔

صحیح: مشعرالحرام مکہ معظمہ میں نہیں ہے نہ ہی یہاں قربانی کی جاتی ہے اور نہ سر منڈایا جاتا ہے۔ مشعر حرام کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے اللہ تعالی نے فرمایا (فاذا افضتم من عرفات فاذکرو الله عندالمشعر الحرام) مزدلفہ کو مشعر حرام کہا جاتا ہے۔ ابن عمر کے بقول پورا مزدلفہ مشعر حرام ہے۔ بعض مفسرین کے بقول مشعر حرام مزدلفہ میں قزح نامی ایک پہاڑی کا نام ہے۔ (تفسیر ابن کثیر) یہاں حاجی قربانی نہیں کرتے نہ ہی سر منڈاتے ہیں بلکہ عرفات سے بعد از مغرب نکلنے کے بعض حجاج یہاں قیام کرتے ہیں اور مغرب وعشا کی نمازیں جمع اور قصر کے ساتھ ادا کرتے ہیں اور بعد نماز فجر منیٰ کے لیے کوچ کرتے ہیں وہاں پہنچ کر قربانی اور سر منڈانے کا عمل انجام دیا جاتا ہے۔

رمی جمار: کنکریاں پھینکنا (حاجی منیٰ میں پہنچ کر ایک مقام پر کنکریاں مارتے ہیں اسی کو رمی جمار کہتے ہیں)

صحیح: حاجی حضرات منیٰ میں کنکریاں صرف ایک مقام پر نہیں تین مقامات پر پھینکتے ہیں اور اس عمل کو رمی جمرات کہا جاتا ہے۔

غلاف کعبہ: وہ مخملی غلاف جسے ہر سال حج کے موقعے پر کعبے کی مرکزی عمارت پر چڑھایا جاتا ہے۔

صحیح: کعبے کی ایک ہی عمارت ہے تو اسے مرکزی عمارت کہنا بے سود ہے۔

فرض عین اور فرض کفایہ: فرض کفایہ وہ فرض جو چند آدمیوں کے کرنے سے سب کے سر سے اتر جائے جیسے نماز جنازہ، سلام کا جواب

صحیح: اولا تو فرض عین کی تعریف غلط ہے دوسرے فرض کفایہ کی مثالوں کی طرح اس کی مثال نہیں دی۔ تیسرے یہ کہ سلام کا جواب دینا فرض کفایہ نہیں بلکہ واجب ہے اس کا تارک گناہگار ہوگا۔

متشابہات اور حروف مقطعات: متشابہات: متشابہ کی جمع، قرآن شریف کی وہ آیتیں ہیں جن کے معنی سوائے خدائے تعالی کے کوئی نہیں جانتا، جن کے ایک سے زائد معنی ہو سکتے ہیں۔

مقطعات: کپڑے کے ٹکڑے، کترنیں، وہ حروف جو قرآن شریف کی بعض سورتوں کے شروع میں آتے ہیں جیسے الم، یسین، حم،

صحیح: متشابہ آیات کا مفہوم بتایا کہ اس سے مراد قرآن شریف کی وہ آیتیں جن کے معنی سوائے خدائے تعالی کے کوئی نہیں جانتا اور حروف مقطعات کے بارے میں سکوت اختیار کرلیا جب کہ باتفاق علما حروف مقطعات کا معنی صرف اللہ رب العالمین کو معلوم ہے۔

مقام ابراہیم: بیت اللہ میں اس جگہ کا نام جہاں حضرت ابراہیم نے نماز ادا کی تھی۔

صحیح: مقام ابراہیم بیت اللہ میں اس جگہ کا نام نہیں جہاں حضرت ابراہیم نے نماز ادا کی تھی۔ مقام ابراہیم کا ذکر سورۂ بقرہ کی آیت نمبر 125 (واتخذ وامن مقام ابراہیم مصلی) میں آیا ہے۔ یہاں مقام ابراہیم سے مراد وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانۂ کعبہ کی تعمیر کی تھی۔ (ایسر التفاسیر 111/1)

مقام محمود: پسندیدہ درجہ، خوبیوں کا سب سے اعلیٰ درجہ، اس مقام کا نام جہاں شب معراج آنحضرت صلعم پہنچے تھے۔

صحیح: مقام محمود اس مقام کا نام نہیں جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شب معراج پہنچے تھے بلکہ اس سے مراد مفسرین کرام کے بقول شفاعت عظمی جو اللہ کے رسول کو قیامت کے دن عطا ہوگی اور آپ اپنی

امت کی شفاعت کریں گے۔ اس کا ذکر قرآن کریم کی آیت کریمہ (عسی ان یبعثک ربک مقاما محمودا) میں آیا ہوا ہے اور مفسرین نے اس سے مراد وہی معنی لیا ہے جو ابھی مذکور ہوا۔ (دیکھیے ایسر التفاسیر 217/3)

مقام مصلی: کعبہ شریف میں وہ جگہ جہاں حضرت ابراہیم نے نماز پڑھی

تصحیح: مقام مصلی سے مراد وہ جگہ نہیں جہاں حضرت ابراہیم نے نماز پڑھی تھی اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ رب العالمین مقام ابراہیم کو جائے نماز بنانے کا حکم دیتا ہے۔(واتخذوا من مقام ابراھیم مصلی)

من وسلویٰ: وہ کھانا جو حضرت موسیٰ کے لشکر بنی اسرائیل جب وہ بھوک سے پریشان تھے، شام کے ایک پرخار میدان میں نازل ہوا۔ درختوں پر میٹھی رطوبت جم جاتی وہ اسے اکٹھا کر لیتے اور بے شمار بٹیریں جنگل میں آجاتیں انھیں وہ مار کر بھون لیتے۔

تصحیح: مفسرین کے بقول ''من'' شہد کی طرح میٹھے ایک لیس دار مادے کو کہتے ہیں۔ جب کہ سلویٰ کے بارے میں علمائے لغت کا خیال ہے کہ یہ جمع ہے اور اس کی واحد سلواہ ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ اس کی واحد نہیں۔ سلویٰ ایک ایسے صحرائی پرندے کا نام ہے جس کا گوشت لذیذ ہوتا ہے اور اس کا شکار آسان ہوتا ہے۔ جنوبی ہوائیں ان پرندوں کو ہر شام بنی اسرائیل کے پاس لے آتی تھیں۔ انھیں عربی میں سمانی یا حباری کہا جاتا ہے۔(ایسر التفاسیر 581)

نصر من اللہ و فتح قریب: ''خداوند تعالیٰ کی مدد شامل ہو تو فتح نزدیک ہے۔'' پوری آیت یہ ہے (واخری تحبونھا نصر من اللہ وفتح قریب) اس کا ترجمہ یوں ہوگا کہ (وہ) تمھیں ایک دوسری (نعمت) بھی دے گا اور وہ اللہ کی مدد اور جلد فتح یابی ہے۔

یتیم: جس کا باپ مرگیا ہو، بن ماں باپ کا، یتیم الطرفین: جس کے ماں باپ دونوں مر چکے ہوں۔

تصحیح: یتیم کی تعریف صحیح کی کہ جس کا باپ مرگیا ہو۔ اس کے بعد بن ماں باپ کا کہہ کر اپنی ہی بات کی تردید کرلی۔ ساتھ ہی یتیم الطرفین کی ترکیب بھی گھڑلی جو کافی دلچسپ ہے۔

بلاضرورت تشدید لگانا جیسے نجاشی کی جیم کو مشدد کیا گیا ہے۔ اسی طرح من وعن میں من کے نون کو مشدد کیا ہے منّ وعن۔ میں نے کئی اردو والوں کو اسی طرح بولتے ہوئے سنا ہے۔ جب کہ اس کے اندر پوشیدہ من اور عن کی باریکی سے صرف عربی زبان کے ماہرین ہی محظوظ ہوسکتے ہیں۔ صیہونی اور صیہونیت کو بتقدیم الہا علی الیا یعنی صیہونی اور صیہونیت لکھا گیا ہے نہ کہ صہیونی اور صہیونیت۔ عجوز کی مونث کے لیے عجوزہ کی بھی ترکیب گھڑی گئی ہے۔ اس کی جمع ہے عجائز جس سے شاید عربی والے بھی نہ واقف ہوں۔ بعض اصطلاحات و تراکیب جیسے معوذتان، (معوذتین) قرآن مجید کی آخری دو سورتیں یعنی سورۃ الفلق اور سورۃ الناس۔ عروس البلاد (سب سے زیادہ خوب صورت شہر) شمس العلما (انگریزی عہد کا ایک خطاب) شمس الثقلین (انسانوں اور جنوں کا سورج، مراد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) شیخ الاسلام (سب سے بڑے پیشوائے دین، مفتی اعظم) شیخ الرئیس (بوعلی سینا کا لقب) حرمین شریفین (مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ، دونوں کو حرمین شریفین کہتے ہیں) حسنین (امام حسن اور حسین) جب کہ لغت کی کتاب ہونے کے ناطے پہلے لفظی معنی بتانا چاہیے تھا پھر ان کے مقصود ومراد۔

واللہ اعلم (خدا زیادہ جانتا ہے مجھے علم نہیں) لکھنے کے بعد کہتے ہیں واللہ اعلم میں واو عطف کا ہے۔ جبکہ واو قسم کے لیے آیا ہے۔

استغفر اللہ اور معاذ اللہ (پناہ چاہتا ہوں میں خدا سے) جبکہ ترجمہ ہے۔ اللہ سے مغفرت چاہتا ہوں اور معاذ کا مطلب پناہ گاہ ہے۔

(ماینطق عن الھوی، نصرمن اللہ و فتح قریب، کل من علیھا فان، مازاغ البصر و ماطغی، اجرغیر ممنون) جیسی کئی آیتوں کے ترجمے غلط درج کیے گئے ہیں۔

کچھ الفاظ و تراکیب جن کے غلط معانی رواج پا گئے ہیں جیسے: روایت ہلال (پہلے دن کے چاند کا نظر آنا) عرش کا معنی ہے (آٹھواں آسمان) اربعین کا مطلب (مختلف قسم کی چار حدیثیں) اثنان حالت رفع میں دو کا عدد، دوسرا) اثنین حالت نصبی وجری میں اس کا معنی ہے (دو) ثلاثی (تین حرفوں سے مرکب، تین گنا) عید (مسلمانوں کے جشن کا روز، خوشی کا تہوار، نہایت خوشی)

کن فکاں (ہوجا پس وہ ہوگئی (مجاز ا دنیا) کن فیکون (ہوجا پس وہ

ہوگیا (مجاز الخلوق، کائنات)

صحیح: لکاں اصل میں لکان فعل ماضی ہے۔ اس کا ترجمہ مونث سے کیا ہے جب لمکون مضارع کا ترجمہ مذکر سے کیا ہے ہو جا پس وہ ہوگیا۔

ایک مشہور عربی ترکیب ''احسنت'' کا لغی معنی ''مرحبا، آفرین، شاباش، واہ واہ، لکھنے کے بعد اس کا پوسٹ مارٹم کرتے ہوئے کہتے ہیں (عربی میں احسنت تھا جس عزیز القدر'' ایک القاب جو چھوٹے کے لیے استعمال کرتے ہیں، غالبا یہ سبقت قلم ہو۔

(کل من علیھا فان)، (مازاغ البصر وماطغی) (ماینطق عن الھوی) (نصر من اللہ وفتح قریب) جیسی آیتوں کا ذکر آتا ہے تو اشارہ کرتے ہیں کہ یہ قرآنی آیتیں ہیں۔ مگر دوسرے مقامات پر (اجر غیر ممنون) (احسن تقویم) (رجما بالغیب) (صم بکم) (عشرۃ کاملہ) (خیط الابیض) (خیط الاسود) (عروۃ الوثقی) (عذاب الحریق) جیسی آیتوں کے ذکر کے وقت یہ اشارہ بھی نہیں کرتے کہ سب قرآن کریم کی آیتوں کے ٹکڑے ہیں۔ اس کے علاوہ خیط الابیض، خیط الاسود، عذاب الحریق، عروۃ الوثقی جیسی آیتوں کے موصوف سے اردو والے اکثر الف لام کو حذف کر کے استعمال کرتے ہیں مگر قرآنی آیات کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ درست نہیں۔

لولاک کے بارے میں لکھتے ہیں کہ مشہور حدیث قدسی لولاک لما خلقت الافلاک کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی اگر تیری (رسول اکرم) کی ذات نہ ہوتی تو میں آسمانوں کو پیدا نہ کرتا) لیکن فبھا کا صرف معنی بہت خوب، بہتر، مراد حاصل، بیان کرتے ہیں جب کہ یہ بھی حدیث شریف فبھا و نعمت کا ٹکڑا ہے اور وہیں اردو میں وارد ہوا ہے۔

اس تحقیق سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فیروز اللغات میں عربی الفاظ و اصطلاحات کے صحیح معانی اور مفاہیم کے بیان کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔ کسی کا لفظی معنی بتایا تو کسی کا مفہوم، کسی کی تشریح کردی تو کسی اصطلاح میں اپنے حساب سے کوئی اور معنی پہنا دیا۔ کسی آیت کے ٹکڑے کی طرف اشارہ کیا کہ قرآنی آیت ہے تو بہت ساری آیتوں کو یوں ہی چھوڑ دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ عربی الفاظ و اصطلاحات پر کام کرنے کے لیے عربی زبان کی نزاکت کا علم ہونا نہایت ضروری ہے ورنہ غلطیوں کا احتمال، امکان سے زیادہ ہوگا۔

فیروز اللغات ایک جامع اور مشہور و متداول اردو لغت ہے، اس میں اس طرح کی غلطیوں کا پایا جانا حیرت انگیز ہے۔ اس سے آج بھی بے شمار طلبہ اور اسکالر مستفید ہو رہے ہیں اس لیے ضرورت ہے کہ آئندہ اشاعتوں میں ان غلطیوں کا تدارک کرلیا جائے تا کہ اس کا فائدہ بدستور جاری و ساری رہے۔

□□□

پتہ:
Department of Urdu, BUSB University Rajouri,
J&K-185131

تعلیمی تشکیل نو کے مسائل

مصنف: خواجہ غلام السیدین

یہ کتاب ماہر تعلیم خواجہ غلام السیدین کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ملک و بیرون ملک کے سیمیناروں میں پڑھے تھے۔ ان مقالوں میں انھوں نے تعلیمی عمل کو تدریسی اور تنظیمی دونوں نوعیتوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ موجودہ دور میں تعلیمی، مادی، سماجی اور اخلاقی ترقی سے متعلق جتنی نئی نئی تحقیقات سامنے آرہی ہیں اسی قدر ہم میں ناآسودگی اور بے چینی بھی بڑھتی جارہی ہے۔ ایسے میں محاسبے، تجزیے اور عمل میں کسی حتمی فیصلے تک پہنچنے کے لیے یہ کتاب ہماری ذہنی تربیت کرتی ہے۔

صفحات: 307، قیمت-/96 روپے

سیدہ جعفر

سمرسٹ مائم — اپنے فکشن کے سیاق و سباق میں

سمرسٹ مائم ایک ایسا تخلیق کار تھا جس نے دنیا کی آبادی کے قابل لحاظ حصے کو جیتے جاگتے انسانوں کی، زندگی کے نشے سے لبریز کہانیاں سنائیں اور انھیں مسرت و بصیرت عطا کی۔ سمرسٹ مائم قصہ گو جادوگر تھا۔ اس کی کہانیاں عوام اور خواص دونوں کا دل موہ لیتیں اور انھیں اپنی قصہ گوئی کے طلسم سے باہر نکلنے نہیں دیتی تھیں۔ نصف صدی سے زیادہ عرصے مغرب سے مشرق تک مائم کے نام کا سکہ چلتا رہا اور قاری اسے خراج تحسین ادا کرتے رہے۔ سمرسٹ مائم نے زندگی کے مزاج کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور انسانی فطرت اور نفسیات کے پیچیدہ، تہہ در تہہ اور حیران کن اسرار و رموز کے مطالعے سے دلچسپی لی ہے۔ سمرسٹ مائم (Somerset Maugham) نے اسی دنیائے آب و گل سے سروکار رکھا ہے اور اس انسان کو موضوع بنایا ہے جو فرشتہ بھی ہے اور شیطان بھی۔ مائم نے انسانی زندگی کے گوناگوں تلخ و شیریں تجربات اور اس کے جلوہ صد رنگ کا مشاہدہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ انسان کے ٹوٹتے بکھرتے خوابوں، اس کی چھوٹی چھوٹی کامیابیوں، خواہشات کی کبھی نہ بجھنے والی پیاس، اس کے مضبوط ارادوں اور کمزور لمحوں کا جائزہ مائم کے فکشن کا موضوع رہا ہے۔ بعض نقادوں نے مائم کو عریاں نگار، بے دین، کلبی اور بیباک مصنف قرار دیا ہے۔ اپنے نقادوں کو مائم نے جواب دیا تھا کہ میں اپنے فکشن میں انسان کی تصویر کشی کرتا ہوں اگر انسان خود غرض، نفس پرست، جبلت سے مجبور اور جنس زدہ ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔

سمرسٹ مائم ایک مشہور و معروف برطانوی ناول نگار ادیب تھا۔ 1954 میں انگلستان کی موجودہ ملکہ، ملکہ ایلزبتھ نے مائم کو اپنا اعزازی مصاحب (Companian of Honour) بنا لیا تھا۔ آکسفورڈ اور دوسری یونیورسٹیوں نے اسے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریاں عطا کی تھیں ''لائبریری آف کانگریس واشنگٹن'' کا فیلو اور امریکہ کے فن و ادب کی قومی سوسائٹی کا اعزازی رکن بھی تھا۔ جمعرات 17 دسمبر 1965 میں مائم نے اس دنیا کو جو اس کی دانست میں بے خدا تھی الوداع کہا تھا۔

سمرسٹ مائم روحانیت، اخلاقیات اور خدا کا منکر تھا۔ تشکیک کا عنصر، اس کی تمام تخلیقات میں اپنا اثر دکھاتا رہتا ہے۔ سمرسٹ مائم کا پہلا ناول ''لیزا آف لیمبتھ'' (Liza of Lambeth) ہے۔ مائم نے اپنے بعض ناول ادب اور فن مصوری کے اکابر کی زندگی کے تناظر میں لکھے ہیں "Moon and six pence" میں مشہور پوسٹ امپریشنسٹ (Post Impressionist) فرانسیسی مصور پال گاگن (Paul Gaugin) کی زندگی کا پرتو نظر آتا ہے۔ ''ہیومن بانڈیج'' (Human Bondage) خود مائم کی تصویر حیات ہے اور کیکس اینڈ ایل (Cakes and ale) میں انگریزی کے مشہور ناول نگار تھامس ہارڈی کی زندگی کی پرچھائیں نظر آتی ہیں ''دی میجی شین'' (The Magician) برطانیہ کی مشہور شخصیت السٹر کراولے (Aleister Crowlay) کی زندگی پر مبنی ہے۔ ''لیزا آف لیمبتھ'' میں قاری کو بعض جگہ مشہور زمانہ آرٹسٹ لیونارڈو (Leonardo) کی زندگی کی جھلک نظر آتی ہے۔ لیونارڈو اپنی ماں کٹرینا کا ناجائز بیٹا تھا۔ لیونارڈو کے استفسار اور اصرار کے باوجود ماں نے اس کے باپ پیروڈاونسی (Pierodavinci) کا نام نہیں بتایا تھا۔ کیونکہ وہ شہر کا ایک بہت معزز عہدہ دار تھا ''عشق میں''، ''پاس عزت داراں'' کے تصور نے کٹرینا کی زبان ہمیشہ بند رکھی تھی۔ بعض ماہرین نفسیات کا تجزیہ ہے کہ لیونارڈو کا شہرۂ آفاق شاہکار ''مونالیزا'' اس لیے ہمیشہ مسکراتی رہتی ہے کہ لیونارڈو نے کبھی اپنی ماں مجسم چہرہ نہیں دیکھا تھا ناآسودہ تمنائیں فن میں کس طرح نئے نئے روپ دھار کر اپنا جلوہ دکھاتی رہتی ہیں، اس کا تجزیہ آسان نہیں۔ خیال آتا ہے کہ لیونارڈو نے کینوس پر جو بے مثال نقش ابھارے ہیں اور جو بے نظیر رنگ آمیزی کی ہے، اس کی تاثر آفرینی اور تابناکی میں کہیں اس کی ماں کا خون تمنا بھی شامل تو نہیں تھا؟ ''لیزا آف لیمبتھ'' میں اسکا ہیرو جم ایک خاصا معمر شخص ہے۔ وہ زندگی کے نشیب و فراز سے بے خبر ایک کمسن اور الھڑ دوشیزہ لیزا کو چاہنے لگتا ہے کچھ عرصہ بعد لیزا بھی جم کی طرف کھینچنے لگی ہے۔ لیزا کے لیے یہ انکشاف پریشان کن ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک ناجائز بچے کی ماں بننے والی ہے بالآخر جم لیزا کو رسوا اور تنہا کر کے اس سے تمام تعلقات منقطع کر لیتا ہے۔ لیزا نے کسی کو جم کا نام نہیں بتایا تھا۔ لیزا ٹام کو حقارت کی نظر سے دیکھتی تھی لیکن وہ لیزا کا سچا چاہنے والا تھا۔ ٹام کا خیال تھا کہ محبت غیر مشروط، صلے اور جواب کی تمنا سے بے نیاز، اپنے طور پر ایک مکمل اور خود مکتفی جذبہ ہے۔ وارفتگی اور فدویت کے جذبے سے سرشار ٹام کو لیزا کے لیے جان کا سودا

بھی مہنگا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ لیزا کی پریشانی دور کرنے کے لیے وہ اس کے بچے کا باپ بننا قبول کر لیتا ہے۔ اس ناول میں ٹام اور جم کے کردار دو متفاوت اور متضاد سیرتوں کے نمائندہ کردار ہیں۔ جم ایک خود غرض، بزدل اور مصلحت پسند انسان ہے۔ لیزا کے بچے کا باپ ہونے کا اعتراف کر کے اپنی رفیقۂ حیات کے ردِعمل اور نجی زندگی میں اٹھنے والے طوفان کا مقابلہ کرنے کی اس میں ہمت نہیں ہے اور محبت کی خاطر اپنی گھریلو زندگی کو تہہ و بالا کر لینے میں اسے کوئی عقلمندی نظر نہیں آتی ہے۔ ٹام دوسروں کے لیے ایثار کر کے خوش ہوتا اور اس پر نازاں رہتا ہے۔

سمرسٹ مائم نے انسانی فطرت کی رنگارنگی کو اپنی اکثر تخلیقات کا موضوع بنایا ہے۔ سمرسٹ مائم کا خیال ہے کہ تمام انسان ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے نہیں ہوتے اسی تنوع نے زندگی کو دلچسپ، پہلودار اور مسحور کن بنا دیا ہے۔ سمرسٹ مائم کے اس پہلے ناول نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کی اور مصنف کی معاشی زندگی میں انقلاب آ گیا۔ مائم نے ایک اچھی ملازمت کی پیش کش مسترد کر دی اور فکشن کو ذریعہ معاش بنانے کا تہیہ کر لیا۔ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ تخلیق کار کی پہلی کاوش میں مستقبل کی منزل کی طرف اشارہ مضمون ہوتا ہے اور اس سے تخلیقی پیش رفت کی سمت و جہت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے امریکہ میں ''فرینک او کانل نیشنل شارٹ اسٹوری ایوارڈ'' انگریزی میں لکھے جانے والے پہلے افسانوی مجموعے کو دیا جاتا ہے۔ 2008 میں 28 ہزار پونڈ کا یہ انعام بنگالی نژاد امریکی جھمپا لہری کو عطا کیا گیا تھا۔ خود مائم نے 1947 میں ایک ایسا ہی ایوارڈ دینے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔

سمرسٹ مائم کے ناول ''مون اینڈ سکس پنس (Moon and six pence) میں فرانس کے پوسٹ اسپریشنسٹ مصور پال گاگن کی زندگی کا پرتو نظر آتا ہے اس ناول میں مائم نے آرٹ، عورت، محبت، اخلاقی ضوابط اور سماج کے بارے میں اپنے منفرد خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اٹا (Ata) ہیرو کی دوسری بیوی تھی جسے اس نے محبت کر کے اپنایا تھا لیکن کچھ عرصے بعد جذباتی اور ذہنی طور پر وہ اس سے دور ہونے لگتا ہے۔ ہندی ادب کے معروف فکشن نگار گل شیر خاں ثانی نے اپنی تخلیق ''آنکھیں'' میں ازدواجی زندگی کے ایک مخصوص تجربے (Contugal Boordom Conjucal) کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ کبھی کبھی انسانی فطرت کا یہ پہلو بھی سامنے آتا ہے کہ ازدواجی زندگی میں شب و روز ایک دوسرے کی محبت میں بسر کرنے کی وجہ سے فریقین اپنی شخصیت کی جاذبیت اور کشش سے محروم ہونے لگتے ہیں۔ بہت سے ملمعے اتر جاتے ہیں اور چہروں کا غازہ اڑ جاتا ہے۔ یہ انسانی نفسیات کی ایک بوالعجبی اور انسانی جذبات کا ایک عجیب و غریب تفاعل ہے۔

گل شیر خاں ثانی کا خیال ہے کہ انسان فطرتاً تازگی پسند واقع ہوا ہے۔ ازدواجی زندگی میں کبھی کبھی گزرتے ہوئے ماہ و سال تازگی مٹا کر جذبے کو پژمردہ اور حسیں کو کند کر دیتے ہیں اور زندگی میں یکسانیت اور بے کیفی کا احساس شدید ہونے لگتا ہے اس لیے ساتھ ساتھ رہتے ہوئے بھی فریقین جذباتی طور پر دور ہو جاتے ہیں۔ ''مون اینڈ سکس پنس'' کا ہیرو اسٹرک لینڈ بالآخر اٹا کو چھوڑ کر south seas چلا جاتا ہے۔ یہاں وہ اپنے فن کے ساتھ انصاف کرنا چاہتا ہے اس نے اپنے کاٹیج کی دیواروں پر جنت کی تصویر کھینچی تھی جو آرٹ کا شاہکار تھی۔ اسٹرک لینڈ ایک مہلک بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے اس لیے اس کا کاٹیج نذر آتش کر دیا جاتا ہے۔ پال گاگن اور اسٹرک لینڈ (Paul gagin) دونوں مصور تھے وہ رنگوں اور خطوط کی اہمیت سے آشنا تھے۔ آرٹ کے بعض نقادوں کا خیال ہے کہ تصویر میں لفظ سے زیادہ گویائی اور قوت ترسیل موجود ہوتی ہے انھوں نے لفظ پر رنگ کو ترجیح دی ہے ایک قدیم چینی کہاوت ہے کہ ایک تصویر دس ہزار الفاظ سے زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔ رفائیل، قاسم، میرک، عبدالرحمٰن چغتائی، صادقین اور مقبول فدا حسین کا آرٹ اپنی تاثر آفرینی کی وجہ سے اہل نظر کے دل کی دھڑکن بن گیا ہے۔ اسٹرک لینڈ نے ایک بہتر زندگی کی آرزو کا تصویر ہی کے وسیلے سے اظہار کیا تھا۔ ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ انسان کی ناآسودہ آرزوئیں جو حالات و مواقعات اور جبر وقت کی وجہ سے تکمیل نہیں پاسکتیں لاشعور میں پناہ لیتی ہیں۔ یہ تمنائیں کبھی مردہ نہیں ہوتیں اس لیے لاشعور تمناؤں کا مدفن نہیں ان کا مخزن ہوتا ہے۔ یہ خواہشات موقع پاتے ہی شعور اور اظہار کی دنیا میں اس طرح در آتی ہیں کہ خود فنکار کو اس کا احساس نہیں ہوتا۔

''ہیومن بانڈیج'' (Human Bondage) خود مائم کی تصویر حیات ہے۔ طبی طالب علم مائم ہی ہے۔ ملڈریڈ ناول کے ہیرو کیری کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے۔ ملڈریڈ پیچیدہ نفسیات کی حامل اور غیر معمولی طور پر جذباتی لڑکی ہے اس ناول کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مائم نے زندگی کے نئے نئے تجربات، غیر متوازن شخصیت کے عمل، انسانی نفسیات کی گتھیوں سے پیدا ہونے والے مسائل اور زندگی کی رنگارنگی کا بڑی سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ فلابرٹ (Gustave Flabert) کے مشہور ناول ''میڈیم بوواری'' (Madan Bouary) کی ہیروئین ایما باوری ایک ابنارمل شخصیت ہے ملڈریڈ اپنا ہیرو بدلتی رہتی

ہے۔ بعض ماہرین نفسیات نے ایسی عورت کے لیے جو اخلاقی حیثیت سے گمراہ اور ہرجائی ہوتی ہے بعض وقت "باور ازم" (Bovarism) کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے۔ سمرسٹ ماٴم نے انسانی نفسیات کے سربستہ رازوں کی آگہی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے "ہیومن باونڈیج" کو شائع کرنے سے اکثر پبلشروں نے انکار کردیا تھا اس میں ماٴم ایک بیباک حقیقت نگار نظر آتا ہے۔ موپاساں (Guy De Maupassant) کی طرح ماٴم نے انسان کو جبلت کے تناظر میں دیکھا اور دکھایا ہے۔ اپنے ایک مختصر افسانے رین (rain) میں بھی ماٴم نے جنسی آزادی کی حمایت کی ہے۔ اپنی زندگی میں خود ماٴم ایک عیش پسند اور بوالہوس انسان اور ایک بدنام ادیب تھا۔ عیسائی مشنری ریورنٹ ڈیوڈسن اور ڈاکٹر ساڈی تھامسن اس تخلیق کے اہم کردار ہیں۔ ساڈی اخلاقی اقدار کی قائل نہیں ہے۔ مبلغ ڈیوڈسن اس کو نیکی کے راستے پر لانے کی کوشش میں خود گمراہ ہوجاتا ہے۔ گناہ کا مرتکب ہوکر ندامت میں خودکشی کرلیتا ہے۔ ساڈی سمجھتی ہے کہ خواہشات کی تکمیل کرنے والے اگر بدکردار اور گناہ گار کہلاتے ہیں تو یہ نارمل آدمی کے لیے کوئی نامناسب خطاب نہیں ہے۔ دنیا ان لوگوں کو کون سا بڑا تمغہ عطا کرتی ہے جو اپنی ساری زندگی پاک دامنی کے ساتھ گزار دیتے ہیں۔ یہ خود ماٴم کا انداز نظر ہے۔

"ریزرس ایج" (Razor's Edge) میں ماٴم نے متضاد تہذیبی رجحانات کی آویزش کا ذکر بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ کیا ہے۔ "حیاتی تسلسل" (Vita Continuity) (جو دو جبلتوں یعنی تحفظ ذات اور اشاعت ذات پر مشتمل ہوتا ہے)، کا عنصر اس ناول میں نمایاں طور پر اپنی جھلک دکھاتا رہتا ہے۔ واقعات کی کڑیاں جوڑ کر قصے کے خدوخال اجاگر کرنے کے ہنر سے ماٴم خوب واقف ہے۔ ماٴم انسان کو ہمدردی کی مستحق ہستی تصور کرتا ہے اور زندگی کے سفر میں انسان کی آبلہ پائی پر اسے رحم آتا ہے۔

"پینٹ ویل" (Painted veil) میں ماٴم نے راہبوں کی زندگی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ماٴم ان کی نفس کشی اور انتہا پسندی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ ماٴم نے راہبہ عورتوں کی زندگی اور ان کے تہذیبی اور جذباتی مسائل کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ماٴم کہتا ہے کہ جسم ایک مرئی، زندہ اور ناقابل تردید حقیقت ہے۔ راہبہ عورتیں مصنوعی اور غیر فطری زندگی بسر کررہی ہیں اس لیے ان کی شخصیت ادھوری اور ان کے خواب بے تعبیر ہیں۔ اس ناول کی ہیروئنیں اخلاقی قوانین کو مضحکہ خیز تصور کرتی ہے۔ ماٴم کے ناول اور افسانے اس کے نظریۂ حیات اور زندگی کے بارے میں اس کے مخصوص انداز نظر کے ترجمان ہیں۔ ماٴم کا خیال ہے کہ زندگی میں ہمیشہ حق وصداقت کی فتح نہیں ہوتی کبھی شر بھی خیر پر غالب آجاتا ہے۔ سمرسٹ ماٴم نے "آوٹ اسٹیشن" (Out Station) میں دو برطانوی افسروں کا ذکر کیا ہے ایک نیکی کا مجسمہ اور دوسرا شر کا پیکر ہے اور وہ بالآخر نیکی کو اپنے راستے سے ہمیشہ کے لیے ہٹا دیتا ہے۔ سمرسٹ ماٴم نیکی اور خیر کو فتح مند دیکھنا چاہتا ہے۔ ماٴم انسان سے محبت کرتا ہے وہ بے درد اور بے حس تخلیق کار نہیں۔ انسان کی نارسائی، اس کے زخموں کی ٹیس اور اس کی محرومیوں کے کرب سے ماٴم متاثر ہوتا ہے۔

سمرسٹ ماٴم کی "کیکس اینڈ ایل" (Cakes and ale) کے بارے میں بعض نقادوں کا خیال ہے کہ وہ تھامس ہارڈی کی تصویر حیات ہے۔ اس میں ایک نوجوان ایک شادی شدہ عورت سے محبت کرنے لگتا ہے۔ ڈریفلڈ کی پہلی بیوی روزی (Rosei) ایک دلچسپ نسوانی کردار ہے۔ وہ نیک چلن اور پاکباز عورت نہیں۔ جب ڈریفلڈ کی دوسری بیوی اس کی بداخلاقی اور آوارگی پر چوٹ کرتی ہے تو سمرسٹ ماٴم درمیان میں بول پڑتا ہے "یہ بے حیائی نہیں اس کی فطرت ہے" یہاں ماٴم کی تخلیق "سمنگ اپ" (Summing up) کا یہ جملہ یاد آتا ہے کہ "زندگی کا حسن اسی میں ہے کہ ہر شخص اپنی فطرت اور ضرورت کے مطابق کام کرے۔" اردو نثر میں سجاد انصاری نے اپنی کتاب "شیطان اور خدا کے بارے میں اپنے منفرد اور روایتی انداز فکر سے مختلف خیالات کا اظہار کیا تھا۔ جب "محشر خیال" کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تعلیمی نصاب میں شامل کیا جارہا تھا تو بعض گوشوں سے اس کی بڑی مخالفت کی گئی تھی (The Fall of Edward Burnal) جنوبی بحرالکاہل کے ایک خوبصورت جزیرے کی کہانی ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مصنف نے بلیغ اشاروں کی مدد سے انسانی رویوں کی معنویت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ایڈگرایلن پو (Edgar Allan Poe) نے کہانی کو "زندگی کی ایک قاش" کہا تھا تو اس کی مراد اس کے ارتکاز سے بھی تھی اپنے ایجاز واختصار کے باوجود ماٴم کے افسانے بہت سے معنی خیز اشاروں کا احاطہ کرتے ہیں۔ ماٴم اس ہنر سے آشنا تھا اور اس نے اس سے اچھا کام لیا ہے۔ Roldghl کی طرح وہ اپنی تخلیقات کا کثیر معاوضہ پانے والا فنکار تھا۔ سمرسٹ ماٴم کے فکشن کے مطالعے سے اس کے تصورات وافکار کا اندازہ ہوتا ہے۔ ماٴم کا خیال ہے کہ انسان ایک ازلی اور ابدی ہیجان، تشنگی اور ناآسودگی سے ہمکنار رہتا ہے۔ ہیجان اور اضطراب انسانی زندگی کا مقدر ہے۔ آرزو اور تکمیل آرزو دونوں انسان کو مضطرب رکھتے ہیں۔ اردو کے ایک شاعر نے کہا تھا:

ہم تم ملے نہ تھے تو جدائی کا تھا ملال
اب یہ ملال ہے کہ تمنا نکل گئی

مائم کا تصور یہ ہے کہ اس بھری دنیا میں انسانوں کے ہجوم کے درمیان انسان بالکل تنہا ہے۔ اپنے گوناگوں مسائل، اپنے شکستہ خوابوں کے درد اور محرومی و نارسائی کی خلش کے ساتھ اسے جینا پڑتا ہے اور انسانی فطرت کی سیمابیت اسے چین لینے نہیں دیتی۔ مائم کے بعض افکار کی سرحدیں Existentialism کے تصورات سے قریب نظر آتی ہیں۔ زندگی کی کجروی اور اس کے بدلتے ہوئے تیوروں کا سمرسٹ مائم کو شدید احساس ہے شائد یہی وجہ ہے کہ کہیں کہیں اس کا زاویہ نظر قنوطی محسوس ہونے لگتا ہے۔ سمرسٹ مائم کا خیال ہے کہ زندگی زاویہ نظر، رویے اور تجربات و مشاہدات انھیں نئی معنویت عطا کرتے ہیں بعض نقاد مائم کو دوسرے درجے کا فکشن نگار تسلیم کرتے ہیں اور اسے غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل تصور نہیں کرتے۔

مائم چیخوف کا قائل ضرور ہے لیکن ذہنی اور جذباتی طور پر وہ موپاساں سے نسبت رکھتا ہے۔ مائم موپاساں کی طرح زندگی کی سچائیوں کو بڑی آزادی اور بیباکی کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ ناگفتنی کو گفتنی بنانے کا رجحان مائم کو موپاساں سے قریب کردیتا ہے۔ جارج اورول (George Orwell) کہتا ہے کہ جدید تر مصنفین میں مجھے سمرسٹ مائم نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔

□□□

پتہ:
9-1-24/1, Langer Nagar, Hyderabad-500008-A.P.

صنعتی تنظیم اور انتظام

مصنف: محمد احترام اللہ

آج کے صارفی سماج میں انتظامی شعبے کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ایک کامیاب منتظم حال پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ مستقبل کے لیے منصوبہ بندی بھی کرتا رہتا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف بی.کام کے طالب علموں کی ضرورت کو پوری کرتی ہے بلکہ علم دوست اردو قاری کو بھی جدید صنعتی شعبے اور معیشت کے دیگر رموز سے آگاہ کرتی ہے۔

صفحات: 606، قیمت -/149 روپے

دکنی نثر کا انتخاب

مرتبہ: سیّدہ جعفر

دکنی نثر کا یہ انتخاب دکن میں اردو نثر کی ابتدا سے فورٹ سینٹ جارج کالج کے زمانے تک کے مصنفین کا احاطہ کرتا ہے اور ان کی تصانیف کے نمائندہ منتخبات پر مشتمل ہے۔

صفحات: 168، قیمت -/45 روپے

ہندوستان کا صنعتی ارتقا

مصنف: ڈاکٹر ڈی.آر. گیڈگل، پروفیسر ایم.صدیقی

ہندوستان کی تاریخ میں 1857 ایک اہم سنگِ میل ہے۔ اس سال نہ صرف ملک پر پوری طرح سے انگریز قابض ہوگئے بلکہ اسی کے بعد ہندوستانیوں کی خود احتسابی کا دور بھی شروع ہوا جس کے نتیجے میں مختلف اصلاحی تحریکات وجود میں آئیں اور ملک نشاۃ الثانیہ سے ہم کنار ہوا۔ 1857 کے بعد سے وہی صحیح معنوں میں ہندوستان کی صنعتی ترقی بھی شروع ہوئی۔ اس کتاب میں 1860 سے 1939 تک ملک کے صنعتی ارتقا کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

صفحات: 343، قیمت -/130 روپے

مخمور سعیدی

اردو تنقید آزادی کے بعد

اردو میں باقاعدہ ادبی تنقید کا آغاز مولانا محمد حسین آزاد مولانا الطاف حسین حالی اور مولانا شبلی نعمانی سے ہوا۔ ان سے پہلے شعرا کے تذکروں میں لکھنے والوں نے شعرا کے کلام پر جو اظہار خیال کیا ہے اسے ہم چاہیں تو تاثراتی تنقید کے ابتدائی نمونوں کا نام دے سکتے ہیں، کیونکہ اس کی بنیاد کسی سائنٹفک اصولِ تنقید پر نہیں ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد کی ''سخندانِ فارس'' فارسی شعرا کے حوالے سے ہے۔ ان کے تنقیدی تصورات کا سراغ اس کتاب میں بھی ملتا ہے لیکن ان تصورات کا زیادہ واضح اظہار ''آبِ حیات'' میں ہوا ہے جو اردو شعرا کے تذکروں اور ان کے شاعرانہ اوصاف کی پرکھ پر مشتمل ہے۔ آزاد بنیادی طور پر انشاپرداز تھے چنانچہ ان کے اس میلان کی کارفرمائی ''آبِ حیات'' کے صفحات پر بھی نمایاں ہے۔ بعض مقامات پر انھوں نے جانب داری سے کام لیا ہے مثلاً اپنے استاد شیخ ابراہیم ذوق کے شاعرانہ مرتبے کے تعین میں وہ مبالغہ آرائی کی تمام حدیں پار کر گئے ہیں۔ ان پر غلط بیانیوں کے الزامات بھی عائد ہوئے ہیں اس کے باوجود ''آبِ حیات'' اردو زبان و ادب کی تاریخ میں بنیادی حوالے کی حیثیت رکھتی ہے۔

مولانا شبلی کی ''شعرالعجم'' بھی فارسی شعرا کے تذکرے اور ان کے کلام کے تنقیدی محاکمے پر مبنی ہے لیکن ''موازنۂ انیس و دبیر'' اردو کے دو بڑے مرثیہ گو شعرا انیس اور دبیر کا تقابلی مطالعہ ہے۔ یہ مطالعہ جن تنقیدی اصولوں کی روشنی میں کیا گیا ہے انھیں بڑی حد تک سائنٹفک کہا جاسکتا ہے اور ان سے شاعری کے محاسن اور معائب کا ایک واضح خاکہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ بعد میں شبلی کی یہ دونوں کتابیں بھی معرضِ بحث میں آئیں اور نہ صرف ان کی بعض اغلاط کی نشاندہی کی گئی بلکہ ''موازنۂ انیس و دبیر'' کے حوالے سے ان پر دبیر کے مقابلے میں انیس کی بے جا طرف داری کا الزام بھی لگا۔ لیکن ان دونوں کتابوں کو اردو کے تنقیدی سرمائے میں آج بھی احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی کا ''مقدمۂ شعروشاعری'' ان کے ہم عصروں کے علاوہ ان کے بعد آنے والی نسلوں میں بھی سب سے زیادہ موضوعِ بحث رہا۔ اس میں ہماری شعری روایت کے بعض میلانات بالخصوص لکھنوی شاعری کے آرائشی اسلوب اور دورازکار مضامین کی تکرار کو ہدفِ ملامت بنایا گیا تھا اس لیے اہلِ لکھنؤ کی طرف سے اس کے خلاف شدید ردِعمل ہوا جو ایک مدت تک جاری رہا۔ ''اودھ پنچ'' اور اس کے ہم نوا اخبارات و رسائل میں برابر مولانا حالی کے خلاف لکھا جاتا رہا۔ یہ شعر اسی زمانے کی یادگار ہے:

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدانِ پانی پت کی طرح پائمال ہے

مولانا حالی پانی پت کے رہنے والے تھے دوسرے مصرعے میں اس سے لطف پیدا کیا گیا ہے۔

مولانا فضل الحسن حسرت موہانی اس وقت ابھرتے ہوئے شاعروں میں تھے۔ انھوں نے بھی حالی کے خیالات کو رد کیا۔ اُدھر امداد امام اثر کے خیالات بھی حالی کے خیالات سے متصادم تھے لیکن سرسید جیسی بااثر شخصیت حالی کے طرف داروں میں تھی جس سے حالی کے موقف کو تقویت حاصل ہوئی۔

1936 میں جب ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا تو اس تحریک نے اپنے مقاصد کے استحکام اور فروغ کے لیے حالی کے ادبی خیالات و نظریات کی ایسی توضیح کی جس سے اسے تقویت حاصل ہو۔ حالی ادب کی سماجی افادیت کے قائل تھے اور وہ شاعری سے اصلاحِ احوال کا کام لینا چاہتے تھے۔ مسدس کی ہیئت میں ان کی مشہور طویل نظم ''مدوجزرِ اسلام'' ان کی اسی خواہش نے ان سے کہلوائی تھی۔ ترقی پسند تحریک کے داعی بھی شعروادب کو اپنے مقصد کے حصول کے لیے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے لیکن دونوں کے درمیان ایک حدِ فاصل بھی موجود تھی جسے ترقی پسندوں نے مصلحتاً نظرانداز کیا۔ حالی اور ان کے ہم نوا اصلاحِ احوال کے متمنی تھے جبکہ ترقی پسند پورے متداول نظام کو درہم برہم کرکے ایک نئے سماجی اور سیاسی نظام کی تشکیل کے خواہاں، جس کی روپ ریکھا سوویت روس کے ماڈل پر تیار ہوئی تھی اور اسی کی نگرانی اور سربراہی میں۔ اس کے لیے انھیں تشدد سے بھی گریز نہ تھا۔ ترقی پسند تحریک کا یہ چہرہ 1949 کی بھیمڑی کانفرنس میں کھل کر سامنے

آگیا اور یہیں سے اس میں وہ انتشار پیدا ہوا جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا۔

آزادی کے بعد شعروادب میں جو تنقیدی رجحانات ابھر کر سامنے آئے ان میں سب سے طاقتور رجحان جدیدیت کا تھا۔ جدیدیت کے زیراثر جو تنقید لکھی گئی اس میں لکھنے والوں کی تخلیقی آزادی پر زور دیا گیا یعنی تخلیق کار اپنے نجی مشاہدات، ذاتی محسوسات اور داخلی کیفیات کے زیراثر زندگی کو جس طور پر دیکھے گا، جس انداز میں سمجھے گا، وہی کچھ اس کی تخلیقات میں منعکس ہوگا، وہ ایسے کسی ہدایت نامے کی پابندی نہیں کرے گا جو دوسروں کا وضع کردہ ہو۔

اس رجحان کا اولین نقیب ہندوستان میں ماہنامہ ''تحریک'' تھا جو 1953 میں دلی سے گوپال متل کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا۔ گوپال متل ایک صاحب طرز ادیب، خوش فکر اور پختہ کار صحافی تھے۔ وہ آزادی کے بعد لاہور سے ترک سکونت اختیار کرکے دلی آئے تھے۔ ویسے ان کا آبائی شہر مالیرکوٹلہ تھا جو غیرمنقسم پنجاب کی ایک مسلم ریاست تھی۔ گوپال متل اپنے قیام لاہور کے زمانے میں ترقی پسندوں کے ساتھ رہ چکے تھے اور انھوں نے قریب سے ترقی پسندوں کے نظریاتی موقف اور ان کے طرز عمل کا مشاہدہ کیا تھا اس لیے جب وہ ان کے خلاف صف آرا ہوئے تو انھوں نے ترقی پسندی کی نظریاتی بنیادوں پر بڑی کاری ضربیں لگائیں۔ ان کی اس پہل نے نئے لکھنے والوں کو تو اپنی طرف متوجہ کیا ہی، بعض پرانے لکھنے والے بھی جو ادب کے ترقی پسند نظریے سے اختلاف رکھتے تھے لیکن کسی وجہ سے اب تک انھوں نے اپنی اس موقف کا واضح اظہار نہیں کیا تھا، کھل کر سامنے آگئے۔ مثلاً ''تحریک'' کے ساتویں شمارے میں نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی کا ایک مضمون ''مجھے بھی کچھ کہنے دیجیے'' کے عنوان سے شائع ہوا جس میں ترقی پسندوں کی فنی بے اعتدالیوں اور قلمکاروں کو ہدایت نامے جاری کرنے کی ان کی روش کی گرفت کی گئی تھی۔

ترقی پسندوں کی نظریاتی سخت گیری کے خلاف اولین آواز اٹھانے والے قلمکاروں میں زیادہ تر وہی تھے جو ترقی پسندوں کے ساتھ رہ چکے تھے۔ گوپال متل کا ذکر اوپر آیا۔ ان کے فوراً بعد کے لوگوں میں خلیل الرحمٰن اعظمی، باقر مہدی، عمیق حنفی، وحید اختر اور بشرنواز وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ وحید اختر گو آخر تک خود کو ترقی پسندوں میں گنتے رہے اور جدیدیت کو بھی انھوں نے ترقی پسندی کی توسیع قرار دینا چاہا لیکن ان کے تنقیدی مضامین بھی اور ان کی شاعری بھی ترقی پسندی کے حصار سے باہر کی چیزیں ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، عمیق حنفی اور بشرنواز کی تحریروں نے جدیدیت کی تفہیم اور توسیع دونوں میں اہم رول ادا کیا۔

جدید تنقید نگاروں اور تخلیق کاروں کی تحریریں جن رسالوں میں اہتمام سے شائع ہوتی رہیں اور نئے تنقیدی مباحث کو آگے بڑھاتی رہیں ان میں ''شب خون'' کے اجرا سے پہلے جو 1966 میں الہٰ آباد سے جاری ہوا ''تحریک'' کے علاوہ ''صبا'' حیدرآباد کا نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ اس کے مالک و مدیر سلیمان اریب تھے جو راسخ العقیدہ ترقی پسند رہ چکے تھے مگر جنھوں نے جدیدیت کے لیے بھی اپنے دل و دماغ کی کھڑکیاں کھلی رکھیں۔ کلام حیدری کی ادارت میں گیا سے نکلنے والے ماہنامہ ''آہنگ'' اور ہفت روزہ ''مورچہ'' میں بھی ترقی پسندی اور جدیدیت کی گرماگرمی رہی۔ کبھی کبھی ماہنامہ ''شاعر'' بمبئی میں بھی جس کے مدیران دنوں اعجاز صدیقی تھے، یہ گرماگرمی نظر آجاتی تھی۔ نئے لکھنے والوں کی نگارشات تو اس میں تواتر سے چھپتی تھیں لیکن یہ رسالہ اس بحث میں فریق کبھی نہیں بنا۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ''شب خون'' 1966 میں الہٰ آباد سے جاری ہوا۔ اس کے بانی مدیر شمس الرحمٰن فاروقی تھے۔ فاروقی جدیدیت کا علم لے کر اٹھے تھے لیکن ''شب خون'' کا اجرا ہوا تو اس کے شعبۂ ادارت میں ڈاکٹر اعجاز حسین اور سید احتشام حسین جیسے جید ترقی پسندوں کے نام بھی تھے۔ ''شب خون'' کے صفحات پر سید احتشام حسین اور عمیق حنفی میں ترقی پسندی اور جدیدیت کے نزاع کو لے کر جو بحث ہوئی وہ دلچسپ بھی تھی اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ اپنے روادارانہ مزاج کے باوجود احتشام صاحب اپنے نظریات میں کتنے کٹر تھے۔

جدیدیت کے فروغ میں ''شب خون'' نے تاریخی کردار ادا کیا۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی تحریروں نے نہ صرف جدیدیت کی تفسیر و توضیح کی، انھوں نے اہم جدید شاعروں اور افسانہ نگاروں کی تخلیقات کی تعیین قدر بھی جدیدیت کے اصولوں پر کی۔ فاروقی چونکہ جدیدیت کے پرجوش مبلغ تھے اس لیے انھوں نے اسے ایک واضح شکل دینے کی کوشش میں اس کے کچھ خدوخال متعین کرنے چاہے۔ اس کے نتیجے میں کچھ قلم کاروں نے جو انھی کی طرح جدیدیت کے حامی تھے لیکن فاروقی کے متعین کردہ جدیدیت کے خدوخال کو قبول کرنے میں انھیں تامل تھا، ان سے اختلاف بھی کیا۔ یہ اختلاف شاعری سے زیادہ افسانے کو لے کر تھا۔

جدیدیت کے رجحان نے اگرچہ تنقید اور تخلیق دونوں شعبوں میں

ترقی پسند تحریک کو پسپا کر دیا تھا لیکن پسپائی کے احساس کے باوجود اس تحریک کے علم بردار پوری طرح سپر انداز نہیں ہوئے تھے۔ عابد سہیل کی ادارت میں لکھنؤ سے نکلنے والا ماہنامہ ''کتاب'' ترقی پسندی کے معتدل روپ کا پرچارک تھا۔ اس میں اگرچہ ترقی پسند مصنفین کو اور ان کی تحریروں کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ لیکن اس میں جدید لکھنے والوں کی تحریریں بھی شائع ہوتی تھیں۔ اس کا تنقیدی حصہ بہرحال ترقی پسند نظریات کا حامل ہوتا تھا لیکن اب ان نظریات میں بھی وہ شدت نہیں رہی تھی جو 1955 سے پہلے تک کی ترقی پسند تحریروں میں نظر آتی تھی۔

جدیدیت کے شب خونی روپ سے جن لکھنے والوں نے اختلاف کیا، ان میں کئی جدید ادیب اور شاعر شامل تھے مگر اس کا برملا اظہار ہوا ''سطور'' دہلی میں جو معتبر اور منفرد جدید شاعر کمار پاشی کی ادارت میں نکلا۔ کمار پاشی شاعری کرنے کے علاوہ افسانے اور ڈرامے بھی لکھتے تھے۔ ان کے افسانے جو ''پہلے آسمان کا زوال'' کے نام سے کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے ہیں اگرچہ علامتی ہیں لیکن انھیں اس طرح کلیتاً پلاٹ سے عاری نہیں کہا جاسکتا جس طرح کے بعض افسانے ''شب خون'' میں شائع ہوئے۔ غالباً فاروقی سے ان کے اختلاف کا نقطۂ آغاز یہی رہا ہو۔

ترقی پسندی سے جدیدیت اور پھر جدیدیت سے مابعد جدیدیت تک کا سفر گزشتہ نصف صدی سے کچھ زیادہ کی مدت کو محیط ہے۔ اس مدت میں ان تینوں میلانات کے کئی نمائندے سامنے آئے جن سے ادبی کتابوں اور رسالوں کے قارئین بخوبی واقف ہیں اس مدت میں ان تینوں رجحانات کی حامل کتابیں بھی شائع ہوتی رہی ہیں۔ گزشتہ صدی کے اواخر میں اردو اکادمی دہلی کے ماہانہ رسالے ''ایوانِ اردو'' نے ایک مباحثہ کا اہتمام کیا تھا جس میں جدیدیت اردو مابعد جدیدیت کے دو اہم ترین داعی شمس الرحمٰن فاروقی اور پروفیسر گوپی چند نارنگ اور ممتاز ترقی پسند ناقد پروفیسر قمر رئیس بھی شریک ہوئے تھے۔ سبھی شرکاء نے مدلل انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ اس بحث کو راقم الحروف نے مرتب کرکے ''ایوانِ اردو'' میں ''ترقی پسندی، جدیدیت او رمابعد جدیدیت'' کے عنوان سے شائع کر دیا تھا۔ اس بحث کا مطالعہ مذکورہ تینوں ادبی رجحانات کو سمجھنے میں آج بھی معاون ہوسکتا ہے۔

ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت اردو تنقید کے حوالے سے یہ تین غالب رجحانات ہیں جو گزشتہ نصف صدی کے تنقیدی منظرنامے پر چھائے رہے ہیں لیکن ان کے علاوہ بھی کئی تنقیدی رویے ہیں جو اپنی موجودگی درج کراتے رہے ہیں، مثلاً اکتشافی تنقید، تجزیاتی تنقید، تاثراتی تنقید وغیرہ وغیرہ۔ ایک تنقیدی نقطۂ نظر ادارۂ ادب اسلامی کا بھی ہے جس کی ترجمانی عبدالمغنی اور ابن فرید وغیرہ کی تحریروں میں ہوئی ہے۔ ترقی پسندوں کی طرح ان کے یہاں بھی تخلیق کی جمالیاتی قدر و قیمت سے زیادہ اس کا افادی پہلو اہم ہے۔

گزشتہ پچاس سال میں جو اہم نقاد سامنے آئے ہیں ان میں سے بیشتر تخلیق کار بھی ہیں۔ اسے تنقید کے حق میں ایک نیک شگون کہا جاسکتا ہے کیونکہ تخلیقی شخصیت کا قائل نقاد تخلیقی عمل کی نزاکتوں اور تخلیق کی فنی لطافتوں کو دوسروں سے کہیں بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے۔

□□□

پتہ:
J-3/14c,
Krishna Kunj Ext., Delhi-92

رام پرشاد بسمل کی آپ بیتی

مرتب: ڈاکٹر وشوامترا پادھیائے/ مترجم: احسان احمد صدیقی

مادرِ وطن کی آزادی کے لیے اپنی جان کی قربانی پیش کرنے والوں میں مشہور انقلابی رام پرشاد بسمل سرِفہرست ہیں۔
یہ آپ بیتی انھوں نے گورکھپور جیل میں اپنی پھانسی سے دو دن پہلے مکمل کی تھی۔ جدوجہدِ آزادی کے اس دور کی
حقیقی تصویر کشی کے سبب یہ آپ بیتی دستاویزی اہمیت کی حامل ہے۔

صفحات: 109، قیمت-/33 روپے

محمد منصور عالم

اردو فکشن کے دو بھائی

غیاث احمد گدی: (پ: 17 فروری 1928 - و: 25 جنوری 1986)

الیاس احمد گدی: (پ: 14 اپریل 1932 - و: 27 جولائی 1997)

وطن: جھریا (جھارکھنڈ)

جھریا کے غیر ادبی ماحول، بالخصوص گدی خاندانوں کے لیے جہاں صرف بھینس پالی جاتی تھی، یہ بات باعث فخر ہے کہ غیاث اور الیاس نام کے دو فکشن نگار پیدا ہوگئے۔ یہ دو بھائی ایسے ادیب ہیں جنھوں نے اردو فکشن کو موضوع اور اسلوب کی نئی جہت بخشی ہے۔

غیاث احمد گدی نے نئے انداز کے کئی وقیع افسانے لکھے۔ ان میں ''بابا لوگ''، ''پہیہ''، ''پرندہ پکڑنے والی گاڑی''، ''تج دو تج دو''، ''افعی''، ''ناردمنی''، ''دیمک''، ''خانے تہہ خانے''، ''سائے ہمسائے''، ''طلوع''، ''دھوپ''، ''چٹکی بھر ہریالی'' اور ''کبوتری'' بہت مشہور ہوئے۔ غیاث کے تین افسانوی مجموعوں۔ بابا لوگ، پرندہ پکڑنے والی گاڑی اور سارا دن دھوپ، میں 37 افسانے شامل ہیں۔ ان کے علاوہ رسالوں میں بھی کئی افسانے پڑے ہیں۔

الیاس احمد گدی نے بھی خوب لکھا۔ اگرچہ گھر ہی میں افسانہ نگاران کے بڑے بھائی غیاث موجود تھے، لیکن الیاس نے ان کا اثر نہ لیا۔ ان کے اسلوب میں نہ لکھا۔ انھوں نے زندگی کے حقائق پر اپنے زاویے سے نظر کی۔ اپنے موضوعات چنے اور اپنا انداز بیان اختیار کیا۔ ان کے افسانوں میں ''تھکا ہوا دن''، ''سدھ کیا ہوا سانپ''، ''گونج''، ''ٹکڑا''، ''دن کا زوال''، ''بٹوارہ''، ''چلو بھر خون''، ''سب سے بڑا سچ''، ''آدمی''، ''میری کہانی ان کا فسانہ''، ''سزا''، ''عجائب سنگھ''، ''ہارے ہوئے لوگ'' اور ''لذت سنگ'' کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ الیاس کے دو افسانوی مجموعے منظر عام پر آئے۔ آدمی، تھکا ہوا دن، ان دونوں میں 28 افسانے شامل ہیں اور کچھ رسالوں میں ہوں گے ہی۔

غیاث عمر ہی میں نہیں، اردو افسانہ نگاری میں بھی الیاس سے بڑے ہیں۔ ان پر کام بھی زیادہ ہوا ہے۔ کئی یونیورسٹیوں میں ان پر تحقیقی کام انجام پائے ہیں۔ ان کے کچھ افسانوں کا آزادانہ تنقیدی جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ گیا کے مشہور افسانہ نگار کلام حیدری سے راہ و رسم کی بنا پر ان سے موازنہ بھی کیا گیا ہے۔ ایسی توجہ الیاس پر نہیں ہوئی ہے۔ شاید اس کی وجہ بھی ہے۔ غیاث عمیق نفسیاتی اور معاشرتی معاملات کو اٹھاتے ہیں۔ لیکن الیاس کے موضوعات میں ہلکا پن ہوتا ہے۔ غیاث جس چیز کو دیکھتے ہیں، بہت غور اور گہرائی سے دیکھتے ہیں اور جس تصور کو پیش کرتے ہیں، اعلیٰ ادبی شان سے پیش کرتے ہیں۔ زبان میں شاعرانہ دل کشی ہے، بیان میں حسن بلاغت ہے اور مجموعی طور پر تحریروں میں ایک گہری سنجیدگی کی فضا قائم رہتی ہے۔ ان کی استعاراتی پلاٹ سازی سے ماجرا بہت حد تک پُر اسرار رہتا ہے۔ الیاس بھی ایسی فضا بناتے ہیں لیکن کبھی کبھی، ورنہ عموماً وہ خارجی بیانات کو ترجیح دیتے ہیں۔ کہیں کہیں انھوں نے علامتی اظہار میں کامیابی حاصل کرلی ہے، مثلاً منصوبہ بند فساد کے موضوع پر ان کا افسانہ ''سدھ کیا ہوا سانپ'' یقیناً اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن ان کے دو ایک افسانے ایسے ہیں جن میں تفہیم کی ڈور کا سرا نہیں ملتا۔ جیسے انھوں نے ''ابارشن'' کے عنوان سے جو افسانہ لکھا ہے، اس میں ایک بھینس کے جسم میں ہاتھ ڈال کر اس کے مرے ہوئے بچے کو زبردستی باہر کھینچنے کی تفصیل ہے۔ وہ کیا دکھانا چاہتے ہیں، وہ تو ان کے مفصل بیان سے ظاہر ہے۔ مگر کیا کہنا چاہتے ہیں، وہ پتا نہیں چلتا۔ اگر کسی قوم/ملت/معاشرہ/زبان/تہذیب بھی مرجائے گی۔ اگر وہ ابھی زندہ ہو مگر اس کی محفوظ افزائش ممکن نہ ہو تو اس صورت میں بھی اس کا زندہ رہنا محال ہے۔ تو پھر کوئی سی صورت اختیار کی جائے۔ افسانے میں جو صورت اختیار کی گئی ہے وہ بہت خطرناک اور ڈراؤنی ہے اور ذہن کو شدید ناامیدی کی طرف لے جاتی ہے۔ شاید افسانہ نگار کا یہ منشا ہو کہ ابارشن، کا جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے، وہ بہر حال مفید حیات نہیں ہے اور مشین سے ٹکڑوں میں کھینچنے کے مماثل ہے۔ میں نے بہت غور و فکر کے بعد یہ نکات نکالے ہیں۔ دراصل، الیاس اکثر معمولی اور سامنے کے موضوعات کو اٹھا لیتے ہیں۔ ان کے پہلے افسانوی مجموعہ ''آدمی'' میں بیشتر ایسے ہی افسانے ہیں۔ دوسرے مجموعے ''تھکا ہوا دن'' میں بھی مضامین تازہ اور پیچدار پلاٹ سازی کی کمی کھٹکتی ہے۔ جبکہ غیاث اس معاملے میں بہت باشعور اور پختہ کار ہیں۔

الیاس اپنی زبان کو تخیلاتی اور تشبیہی لحاظ سے نہیں بلکہ دیہی عوامی بول چال کی سطح پر برتتے ہیں اور بیان کو بستگی کے بجائے کشادگی سے آشنا رکھتے ہیں۔ ان کے برخلاف غیاث کی زبان میں ادبی مقاصد کے تحت فنکارانہ نقوش اور رموز غالب ہوتے ہیں۔ بے شک بیان کی کشادگی یا کھلے پن اور عوامیت و مقامیت میں بھی ایک حسن ہوتا ہے اور واقعہ بیانی کو زیب بھی دیتا ہے۔ لیکن زبان کو فنی طور پر استعمال کرنے، بالخصوص ادبی صنف ''افسانہ'' کے افسوں کو بیان کرنے کے لیے اس کا عوام سے اوپر اٹھنا بلکہ عوام کے سر پر چڑھ کر بولنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ الیاس ادبی محاسن کے لحاظ سے زبان کو اوپر اٹھانے کی کوشش بھی کرتے ہیں لیکن غیاث کے مقابلے میں یہ کوشش کم نظر آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غیاث نے ترقی پسندی کے بعد جدیدیت سے جو اثر قبول کیا تھا، اس سے الیاس کچھ بے نیاز رہے ہیں۔ علاوہ بریں، غیاث کی تحریروں میں فطرت کی رنگینیوں سے جو وابستگی اور مختلف رنگوں کی جو بوچھار نظر آتی ہے، وہ بھی الیاس کی تحریروں میں کم ہے۔ وہ بعض جگہ بڑے معنی خیز جملے لکھتے ہیں جن سے ان کی عمدہ انشا کا اندازہ ہوتا ہے، تاہم حسن فطرت میں کھو کر اس کے پورے منظر کو سمیٹ لینے کا جو اضطراب غیاث کے یہاں ہے، وہ الیاس کے یہاں نہیں ہے۔

ان بھائیوں نے ناول بھی لکھے ہیں۔ الیاس کے دو ابتدائی ناولوں کا ذکر ملتا ہے: ''زخم'' 1953 اور ''مرہم'' 1954۔ یہ ناول میری نظر سے نہیں گزرے اور میں نے ان کو تلاش کر کے پڑھنا ضروری بھی نہ سمجھا۔ غیاث نے بھی ناول کے نام پر کچھ لکھا تھا مگر وہ شاید نامکمل رہ گیا۔ ان کا ''پڑاؤ'' 1980 میں شائع ہوا۔ اس کو ناول کہہ کر پیش کیا گیا ہے۔ لیکن یہ طویل افسانہ ہے یا اسے ناولٹ کہہ سکتے ہیں۔ اس کا موضوع بے چہرگی کی تعریف جاننا ہے۔ اس کے لیے جو مضمون تازہ پیش کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ ایک فالج زدہ شخص زندگی کے ایسے پڑاؤ پر ہے جہاں وہ اپنی بیوی کی ملازمت کی وجہ سے اس کی محبت اور اپنی تنہائی میں انتشار اور وسوسے کا شکار رہتا ہے۔ جبکہ بیوی اپنے افسر کے ساتھ سیر سپاٹے کرتی ہے، بہت کھل کر گفتگو کرتی ہے اور نازک لمحات بھی گزارتی ہے مگر وہ بہرحال، اپنی عصمت کی حفاظت بھی کر لیتی ہے اس کے لیے یہ مرحلے الگ پڑاؤ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان دو مضامین کی وجہ سے بے چہرگی کا موضوع خاصا کشاکش کا مظہر بن جاتا ہے۔ بے چہرگی سے مراد منافقت نہیں ہے بلکہ غیر یقینی صورت حال اور گم گشتی ہے جیسا کہ کتاب کی پشت پر پیش کردہ بانی (راجندر منچندہ، جدید شاعری کا ایک معتبر نام) کی غزل کی شعروں سے ظاہر ہے۔ غیاث کا خیال ہے کہ چہرہ تو سب کو عطا ہوا ہے اور اسی سے لوگ حسب ضرورت و موقع متعدد بلکہ مختلف نوعیت کے کام بھی لیتے رہتے ہیں۔ پھر مکھوٹوں اور ماسکوں کی کیا ضرورت ہے؟ غالباً اسی لیے غیاث نے یہ دکھایا ہے کہ مکھوٹا فروش کے دن بھر چلانے کے باوجود، کوئی بھی شخص اس سے مکھوٹا نہیں خریدتا۔ اس لحاظ سے یہ ناولٹ ترقی پسندی اور جدیدیت کی غیر ہم آہنگی میں ادب و فکر کا آہنگ پیدا کرنے کی ایک کوشش ہے۔ ''پڑاؤ'' ہماری ادبی زندگی کا ایسا پڑاؤ بن کر ابھرتا ہے جہاں سے ہم اعتماد و یقین کا چراغ جلا کر آگے بڑھ سکتے ہیں۔ لیکن ناولٹ کے آخر میں ''ہے'' اور ''نہیں ہے'' یا ''جھوٹ'' اور ''سچ'' کی دو صورتوں کے درمیان مبہم حالت کے تسمیہ کے لیے اصرار کر کے ناولٹ نگار نے خواہ مخواہ اس کے ادبی مدعا کو محدود کر دیا ہے۔ یہ تو جانی ہوئی بات ہے کہ ہر شے کے دو رخ ہوتے ہیں۔ جو چیزیں ہیں ظاہر میں نظر آتی ہیں، ان کے متعلق بھی ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ اصلاً ویسی ہی ہیں جیسی کہ نظر آ رہی ہیں اور جو چیزیں پوشیدہ ہیں۔ ان کے بارے میں بھی ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ ویسی ہی ہیں جیسی کہ ہم اپنے گمان اور حس سے سمجھ رہے ہیں۔ لیکن یہ اجتماعی معاملہ نہ ہوگا بلکہ ہر شخص کا نجی معاملہ ہوگا کہ پوشیدہ باتوں کی صداقت فہمی کے لیے اس کی بصیرت اور فراست کتنی رسا ہے۔ دراصل ہمارے پاس معلومات حاصل کرنے کے تین ہی ذرائع ہیں۔ علم، عین اور یقین۔ ان کو ہم مطالعہ، مشاہدہ اور ایقان کا نام دیتے ہیں۔ جو معلومات مطالعے سے حاصل ہوتی ہیں وہ خارجی ہیں۔ مشاہدہ سے معلوم کردہ امور میں خارجیت کے ساتھ کچھ داخلیت بھی آ جاتی ہے اور جب کسی امر کے ہست یا نیست، وقوع پذیر ہونے یا نہ ہونے اور سچ یا جھوٹ کا ہم کو اپنی نیک نیتی اور خوش گمانی کی بنیاد پر یقین ہوتی ہے، تو ہم متعین صورت کے برخلاف امکانی صورت اور شبہے کو یکسر رد کر دیتے ہیں۔ مگر بہرحال، ہر انسان گمان و یقین میں الجھتا ہے۔ یہ صورت ہمیں بہت ورغلاتی اور پریشان کرتی ہے۔ اسی لیے ہم چاہتے ہیں کہ آپسی معاملات میں دوسروں کے متعلق حسن ظن رکھیں۔ اگرچہ یہ بہت مشکل مرحلہ ہے لیکن خود اپنی شخصیت کو بچانے کے لیے اس پر قابو پانا بھی ضروری ہے، ورنہ واہمہ ہمیں مثبت سوچ سے منحرف کرتا رہتا ہے۔ لہٰذا، خارجی اور داخلی شواہد کا تجزیہ کر کے ہم کسی ایک پہلو پر، اور وہ خیر و اعتماد کا پہلو ہوتا ہے۔ ٹکنے ہی میں اپنی بھلائی اور عافیت سمجھتے ہیں۔ فکشن میں

واقعات و حادثات کے ظہور اور احساس و بیان کے تیور سے طے ہوتا ہے کہ ہمارے کرداروں کے ساتھ کیا صورت حال پیش آرہی ہے۔ اگر فکشن میں واقعاتی بیانیے کی اہمیت کو نہ سمجھا جائے۔ اگر کوئی واقعہ بیان ہی میں نہ آئے۔ تو محض مبہم اشاروں کی بنیاد پر، جو اصلاً کسی فعلِ مستقبل کی طرف اشارہ نہیں بلکہ حال کے عمل کا اشاریہ ہوتا ہے، ہم اس کا اثبات نہیں کرسکتے۔ مثلاً ''پڑاؤ'' میں سونا کا شوہر مفلوج ہے۔ وہ اپنی بیوی کی جنسی ضرورت کو پورا نہیں کرسکتا۔ سونا اپنے افسر کے ساتھ گھومتی ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس نے اپنی عصمت کی حفاظت نہ کی ہوگی۔ ناولٹ میں کچھ ایسے مکالمے ضرور ہیں جو سونا کو بے باک ثابت کرتے ہیں۔ لیکن کوئی منظر ایسا نہیں ہے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ وہ بے وفا ہوگئی ہے۔ بلکہ عین ممکن ہے کہ افسر کے ساتھ سیر و تفریح اور کھلی گفتگو ہی اس کے جنسی تزکیہ کے لیے کافی ہو۔ ناولٹ کے واقعوں اور مکالموں میں جو ایک احتمالِ خود سپردگی (سونا کے تعلق سے) نظر آتا ہے، وہ بس ایک ادبی تجسس کے لیے ہے۔ یہاں پر واقعتاً اصلی معاملہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے، کی کرید تخلیقی لحاظ سے قطعی ضرورت نہیں۔ اس کرید میں قاری کو ڈالنا ٹھیک نہیں۔ غیاث نے یہیں پر غلطی کی ہے۔

فکشن نگار کو واقعات و احساسات کا ادبی پیرایہ میں ظہور دکھانا ہوتا ہے۔ الگ سے دانش دری کا کوئی سوال کھڑا کرنا اس کے ادبی منصب کو زیبا نہیں۔ غیاث نے ایسا کرکے اپنے ناولٹ کو محدود کردیا ہے بلکہ قاری سے فکشن خوانی کی مسرت چھین لی ہے۔ زندگی میں ایسے پڑاؤ یا موڑ آتے ہیں، جب آدمی بے یقینی کا شکار ہوتا ہے۔ اس وقت اس کا حسنِ ظن اور اعتماد ہی اس کا سہارا بنتا ہے۔ ایک ''وشواس'' ہی اس کو تھامتا ہے۔ ناولٹ کے ابتدائی حصے کے بعد دوسرے حصے کے آغاز میں یہ سطریں ملتی ہیں:

FAR FROM THYSELF, THE SCOPE

OF ALL MY AIMS,

WASTE IN THE SECRET FLAMES,

AND ONLY LIVE BECAUSE I HOPE

— TASSO

میں فی الحال Tasso سے واقف نہیں، لیکن یہ سطریں اچھی لگیں اور یہ اس فالج زدہ شخص اور اس کی بیوی سونا دونوں کے حسب حال ہیں۔ لیکن فالج زدہ شخص پر زیادہ چست منطبق ہوتی ہیں۔ وہ تنہا رہ کر اپنے تمام دیگر مقاصد کے خاشاک کو پوشیدہ شعلوں میں جلا ڈالتا ہے اور بعافیت زندہ رہتا ہے۔ کیونکہ وہ زندگی سے بہت پرامید ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ناولٹ سونا جیسی باعزم عورت کے لیے مفلوج شوہر کے احساس و انتظار کو پیش کرتا ہے۔ وہ شخص موجودہ تنہائی میں سونا کے ساتھ گزرا ہوا بچپن، ازدواجی زندگی کے مزید لمحات اور اب سونا کی مصروفیات کو یاد کرتا رہتا ہے۔ وہ وسوسوں کا بھی شکار ہوسکتا ہے لیکن وہ ٹوٹا ہوا شخص نہیں ہے اور سونا بھی اس کے اعتماد کو مجروح نہیں کرتی۔ ان میں ایک کو دوسرے کے سامنے مکھوٹے پہننے کی ضرورت نہیں ہے۔ سونا جوان ہے، ملازمت کرتی ہے، مخلوط معاشرے میں رہتی ہے، اس لیے کسی کمزور لمحے سے دو چار ہوسکتی ہے۔ چھوٹی رانی والی ''فضول سی ضد'' کو چھوڑ سکتی ہے جس نے جبریہ ہی سہی، اپنے مخصوص بدن کو کتے سے چٹوانا تو گوارا کرلیا تھا مگر Passionate ہوکر بھی راجا کو اپنے ''جسم'' تک راہ نہیں دی تھی۔ سونا اپنے شوہر کو خدا سمجھتی ہے اور اس کے سامنے جھوٹ نہیں بولنا چاہتی۔ شاید کچھ کھل بھی جاتی ہے۔ اس کے باوجود، وہ غیر مردوں سے اپنے کو وہاں پر بچا لے جاتی ہے جہاں کے بعد عورت کو آبرو یافتہ کہا جاتا ہے۔ نسوانیت کی بقا کے لیے یہی عزم کافی ہے۔ اس عزم میں کہیں اور کبھی اضطراری کیفیت سے سطحی طور پر زیر ہوجانا ہرگز ہرگز نسوانیت کو مجروح نہیں کرتا۔

لہٰذا، مبہم صورت حال کو مبہم ہی رہنے دیجیے۔ بالخصوص آپ فکشن نگار کی حیثیت سے تہوں کو نہ ابھاریے۔ اور ہم قاری کو، اصلی بات کیا ہے، کیا نہیں ہے، کی کرید میں مت پھنسایئے۔ اگر پھنسایئے گا تو ہم پہلے شواہد دیکھیں گے اور یہ غور کریں گے کہ واقعہ سنانے والا غلط اشارے تو نہیں کرگیا؟ نیز، اس کے اشاروں کی روشنی کس سمت میں کہاں تک جاتی ہے؟ یہیں پر ہم سوال اٹھائیں گے کہ واقعہ کو خود آپ نے مبہم کیوں رکھا؟ اگر بوس و کنار تک کا منظر دکھایا گیا، تو بھی لازم نہیں کہ اصل و دخول بھی ہوگیا ہو۔ حتیٰ کہ ہم بستری (ایک بستر پر ساتھ سوجانے) سے بھی یہ ثابت نہیں ہوسکتا کہ مباشرت ہوئی۔ اب رہا ''نیم تراشیدہ پتھر'' کا معاملہ، جس کی صورت کے تعین کے لیے غیاث نے اصرار کیا ہے۔ تو میری گزارش یہ ہے کہ یہاں فن ابھی سرے سے وجود ہی میں نہیں آیا ہے۔ انفرادی ذوق اور زاویۂ نظر سے کسی کو اس ''نیم تراشیدہ پتھر'' میں کوئی شکل یا ہیولیٰ نظر آجائے تو یہ اس کی نجی یافت ہے، قطع نظر اس سے کہ سنگ تراش کے ذہن میں ایسی کوئی شکل ہے جس کے لیے اس نے پتھر کو اتنا ہی تراش کر چھوڑ دیا ہے۔ جدیدیت نے فنکاری کے لیے جس ابہامی صورت پر زور دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غیاث اس سے متاثر ہونے

کے باوجود غیر یقینی صورت حال کو یقین کی منزل میں دیکھنا چاہتے تھے۔

اس لحاظ سے "پڑاؤ" میں ماضی کی بازدید، حال کے حقائق اور مستقبل کے امکانی کوائف کا آمیزہ معنی خیز ہوگیا ہے اور ناولٹ کا حسن اسی بات میں پوشیدہ ہے۔ اس کو خواہ مخواہ کے سوال کی کرید سے ضائع نہ کرنا چاہیے اور یہ کرید فنکار کا تو کام ہے بھی نہیں۔

الیاس اس قسم کی کرید سے بچتے رہے ہیں۔ ان کا ناول "فائر ایریا" اردو کا غالباً پہلا ناول ہے جس میں کول فیلڈ کے حالات کو موضوع بنایا گیا ہے اور یہ شاید سب سے بڑی وجہ ہے کہ اس ناول پر الیاس کو ساہتیہ اکادمی انعام ملا۔ کول کمپنیاں کس طرح کام کرتی ہیں۔ کول مزدوروں کی کیا اوقات ہے، کول مافیا کی کیسی مضبوط بساط ہے۔ کول یونینوں اور یونینوں کے لیڈروں کے کیا مقاصد ہوتے ہیں اور ان سے اصلاً کس کی خدمت ہوتی ہے۔ ترقی کی راہیں کس طرح مسدود یا کشادہ ہوجاتی ہیں، ان ساری جہتوں کو ناول کے مواد یا مضمون کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن کہیں "کیوں، کیوں؟" کے سوالات کھڑے نہیں کیے گئے ہیں ناول کا مرکزی کردار سہدیو ہے۔ وہ گیا ضلع کے ایک گاؤں سے جاتا ہے اور اپنے ساتھ رحمت نام کے ایک شادی شدہ نوجوان کو بھی لے جاتا ہے۔ رحمت کی جان کھدان میں چلی جاتی ہے اور لاش کو وہیں کہیں دبا دیا جاتا ہے۔ سہدیو اس حادثے سے متاثر رحمت کے گھر والوں کے سامنے جوابدہی محسوس کرتا ہے اور رحمت کی موت کے معاملے کو یونین میں بھی رکھتا ہے، لیکن اس پر کسی کی توجہ نہیں ہوتی۔ وہ جب تک نوکری کرتا ہے، انتظامیہ اور مافیا سے ٹکراتا ہی رہتا ہے، کیونکہ اس میں چھل کپٹ نہیں ہے۔

زندگی چاہے جس طرح کی شدت اور کشمکش میں گزرے، جنس اپنے پانوں ہر حال میں اور ہر جگہ جماتا ہے۔ ناول میں معاشقے اور ہوس ناکیاں بھی ہیں۔ سہدیو کی مردانہ وجاہت میں کئی عورتیں کشش محسوس کرتی ہیں۔ مجمدار کی منہ بولی بہن پرتی بالا سے تو وہ شادی ہی کرلیتا ہے۔ پھول منی بھی اس کی زندگی میں آجاتی ہے۔ لیکن سہدیو کردار کا بہرحال پکا آدمی ہے۔ دراصل کولڈ فیلڈ کی غربت اور مخلوط مزدوری کی ثقافت باہر سے جانے والوں کے لیے عورتیں ارزاں کردیتی ہے۔

واقعات کی سطح پر نمودار ہوتے ہیں۔ مثلاً کمپنیوں کے افسر، یونین کے لیڈر، مافیا گروہ کے غنڈے، ان سب سے متعدد قسم کے واقعات و حادثات منسلک ہیں۔ اس وجہ سے کردار بھی بہت ہیں، ناول میں ایکشن بھی کثیر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے ناول کو مار دھاڑ کی فلموں کے طرز پر ڈھالا ہے۔ لیکن ادبی دانش وری کے شرارے بھی جابجا موجود ہیں۔ آگے ان کو دیکھا جائے گا تاہم بنیادی بات یہ ہے کہ ماجرا نگاری کے اوصاف سے فکشن کا حسن متعین ہوتا ہے۔ ناول میں کہا گیا ہے کہ کول کمپنیاں ABC یعنی کہ وہ، بلیا اور چھپرہ کے علاقوں سے مزدور نہیں رکھنا چاہتیں۔ پھر بھی کچھ مزدور اور یونین کے سردار اور مافیا غنڈے بھوجپوری بولتے ہیں۔ وہ کس طرح دخل پا گئے؟ ناول کا تیسرا حصہ غیر ضروری بیانات کی وجہ سے ناول کے لیے ناگزیر نہیں ہے۔ ناول نگار نے سہدیو سے جذباتی وابستگی دکھائی ہے۔ اس وجہ سے معروضیت کو کچھ نقصان پہنچا ہے۔

"فائر ایریا" میں الیاس کا مشاہدہ تیز اور باریک ہے۔ مافی الضمیر کے اظہار پر قدرت بھی ہے مگر کہیں کہیں انداز بیان بازاری اور کچھ سوقیانہ ہوگیا ہے۔ ادب ایسی حقیقت نگاری کو قبول نہیں کرتا۔ خواہ کسی کردار کا مقامی بھاشائی تقاضا ہی کیوں نہ ہو۔ ادیب اس کے ہر تقاضے کو پورا نہیں کرسکتا کیونکہ ادب تحریری معاملہ ہے۔ یہاں عملی طور پر ہر بولی اور ہر لفظ کا استعمال ممکن نہیں، موزوں نہیں، مفید نہیں۔ ادیب اپنی زبان کو کرداروں کی بولیوں میں ملانے پر مجبور ہوتا ہے۔ خود الیاس نے بھی بھوجپوری کی نقل کی ہے لیکن اس کو متعلقہ کردار کی بولی میں نبھا دینا ہر جگہ ضروری نہیں سمجھا ہے۔ ان باتوں سے قطع نظر، "فائر ایریا" میں اردو پن یعنی سادگی اور عوامیت اور بلاغت کا امتزاج ہے۔ نیز، خوبی کی بات یہ ہے کہ بعض جملے اس طرح تراشے گئے ہیں جن میں روانی، سلاست اور تاثیر کی فراوانی ہے۔ کچھ جملے بڑا عمدہ ادبی نقش قائم کرتے ہیں: "نیند آنکھوں پر چڑھی آرہی ہے" (ص 139)۔ "رات آج موہنا کولہری میں سرشام آگئی ہے۔" (ص 190) "عورتیں الفاظ کا وہ مطلب بھی بہت جلد نکال لیتی ہیں جو بہت اندر کہیں چھپا ہوتا ہے۔" (ص 196) زیادہ مثالوں کی ضرورت نہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ "فائر ایریا" میں ادبی زبان کا حسن موجود ہے۔ اس کے مقابلے میں "پڑاؤ" کی ادبیت کو دیکھیے تو کہنا پڑے گا کہ "پڑاؤ" کی زبان شاعروں کا سا قصہ رکھتی ہے:

"مجھے گویائی کی شمع نصیب ہوتی تو میں یہ اجالے بغیر نہیں رہتا کہ جسے تم دھول سمجھ رہے ہو، وہ دھول نہیں۔"

"گویائی کی شمع" بہت پر تصنع استعارہ ہے۔ اسی وجہ سے "پڑاؤ" مختصر ہونے کے باوجود تکنیک کی پیچیدگی میں زیادہ "ادبی" ہوگیا ہے۔ تکنیک کی پیچیدگی سے مراد یہ تصنع بھی ہے اور گھماؤدار ماجرا سازی بھی۔ ناول کی ہیروئن سونا ڈبل رول میں ہے۔ ایک مفلوج شخص کی بیوی اور

ایک دفتر کی ملازمہ جس کا افسر اسے اپنے ساتھ گھماتا پھراتا ہے۔ ناولٹ نگار نے کبھی شوہر کے ساتھ کے لمحات اور اس سے بھی پہلے کے بچپن کی دوستی اور کبھی افسر کے ساتھ کی تفریحات او رمکالمات کو یادداشت کی روانی میں جھلکوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس وجہ سے پلاٹ ابھرا، سیدھا نہیں رہا ہے۔ اس پر مزید ہے، احساسات وتاثرات کا سرسراتا ہوا نکل پڑنا۔ اس صورت نے ناولٹ کو خاصا پیچیدہ بنادیا ہے۔ لہٰذا، یہ جدید فکشن کا فنکارانہ نمونہ ہے۔ جبکہ ''فائر ایریا'' نئے فنی شعور کا نہیں بلکہ ایک مخصوص معاشرے کی ثقافت کا آئینہ دار ہے۔

الیاس نے مشرقی پاکستان (اب بنگلہ دیش) کے سفر پر مبنی ایک سفرنامہ ''لکشمن ریکھا کے پار'' بھی لکھا تھا۔ وہ 1968 میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ ناجائز طریقے سے سرحد پار کرکے ڈھاکہ چلے گئے تھے۔ محض گھومنے کی خاطر، وہاں رہنے بسنے کی خاطر نہیں۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے خواب کا ملک کیسا ہے؟ پھر وہ چند دنوں رہ کر واپس آگئے، انھوں نے ڈھاکہ کے علاوہ چھوٹے بڑے کئی شہروں کو گھوم گھوم کر دیکھا اور دیہات بھی دیکھے۔ لوگوں سے باتیں کیں، ان کے مزاجوں، طورطریقوں، ذہنی رویوں کو سمجھا، بنگالی غیر بنگالی کی کشاکش بھی بجھی اور اپنے تاثرات کو بے کم وکاست پیش کردیا۔ کسی غیر ملک کے ناجائز سفر میں پکڑے جانے کا جو خدشہ لگا رہتا ہے اور جن ناقابل یقین صورت حال اور بعید از قیاس مشقتوں میں ایسے آدمی کے شب و روز گزرتے ہیں، ان سب کی مصنف نے زندہ نقاشی کی ہے۔ دراصل الیاس کے مزاج کی شگفتگی اور مشاہدے کی قوت ان کے دلچسپ عوامی اسلوب کے بہت بڑے ادبی حربے ہیں۔ ان خوبیوں نے ان کے سفرنامے کو بہت پرلطف بنادیا ہے۔ مزید خوبی یہ ہے کہ جابجا ناول نگاری کا تخیل اور طریقہ کار نظر آتا ہے۔ یہ سفرنامہ بہار اردو اکادمی، پٹنہ کے جزوی مالی تعاون سے 1998 میں کتابی شکل میں منظر عام پر آچکا ہے۔ مگر یہ پہلی بار ''شب خون'' میں چھپا تھا۔ انھوں نے اپنے بڑے بھائی غیاث کے بارے میں ''مگدھ پوری کا داستان گو'' کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے، وہ بھی ادبی شان کی ایک دلچسپ تحریر ہے۔ اس تحریر سے غیاث کے ذات وصفات کا تعارف بخوبی ہوتا ہے۔ انھوں نے بھائی کا احوال لکھتے ہوئے نہ تو مبالغہ آرائی کی ہے اور نہ کتمان حق کیا ہے اور اپنے خاندانی پس منظر اور گدیوں کے پنچایتی رواجوں کی جو تفصیل پیش کی ہے، اس میں غیاث والیاس جیسے ادیب کی نمود کی کرامت سے کم معلوم نہیں ہوتی۔ یہ مضمون غیاث سے متعلق ہے لیکن یہ بھی ثابت کردیتا ہے کہ خود مضمون نگار بھی مگدھ پوری کا بہترین داستان گو ہے۔

الیاس میں حس ظرافت زیادہ تھی۔ غیاث سنجیدہ تھے۔ مجموعی طور پر غیاث کے افسانے بہتر ہیں۔ مگر الیاس کا ناول ''فائر ایریا'' نئے موضوع کے انتخاب، زمینی حقائق، عوامی سروکار، دنیا کے مزدوروں کے مسائل کے ساتھ، اشخاص، مقامات اور واقعات کے متناسب صفائی بیانات اور بیانیہ کی شگفتہ فطری روانی کی وجہ سے ''پڑاؤ'' سے آگے نکل جاتا ہے۔ لیکن غیاث کی مجموعی تخلیقی ہنرمندی الیاس کے تخلیقی ہنر پر فوقیت رکھتی ہے۔

□□□

پتہ:
University Professor,
Deptt. of Urdu,
Magadh University, Bodh, Gaya

منتخب التواریخ (جلد اوّل، دوم وسوم)

مؤلف: ملا عبدالقادر بدایونی / مترجم: ڈاکٹر علیم اشرف خاں

عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی نہ صرف باکمال شاعر تھے بلکہ تاریخ نویسی میں بھی انھیں ملکہ حاصل تھا۔ معروف مورخ ابوالفضل کے ہمعصر ہونے کے ساتھ ساتھ انھیں بھی اکبری دربار میں رسائی حاصل تھی۔ انھیں ترجمہ اور تالیف پر مامور کیا گیا تھا۔ اسی دوران انھوں نے تاریخ الفی، رزم نامہ، جامع رشیدی اور بحرالاسمار جیسی کتابیں لکھیں۔ اکبری عہد کی ساٹھ سالہ تاریخ سے آگاہی کے لیے ابوالفضل کے ''اکبرنامہ'' کے ساتھ ساتھ ملا عبدالقادر کی ''منتخب التواریخ'' (تین جلدوں میں) کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ملا عبدالقادر نے یہ تاریخ شاہی محل میں بیٹھ کر نہیں لکھی جو بادشاہ اکبر کی پسند وناپسند سے گزرتی بلکہ آزادانہ تحریر کی اور یہی آزادانہ رائے اس کتاب کو ''اکبرنامہ'' سے منفرد کرتی ہے۔

صفحات: جلد اوّل 409 / جلد دوم وسوم 620، قیمت: جلد اوّل-/335 روپے/ جلد دوم وسوم 555 روپے

غضنفر اقبال

سائبر ایج میں کتب و رسائل کی اہمیت

جمہوری نظام کا چوتھا ستون ذرائع ابلاغ ہمیں کئی جہات سے روشناس کراتا ہے۔ ذرائع ابلاغ ہی جمہوریت کے دیگر تین ستون مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ کے مقابل میں معاشرے کو ہر نئی تبدیلی سے روشناس کرواتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ذرائع ابلاغ میں قدیم غاروں کے آرٹ سے لے کر قلم، ریڈیو، ٹی وی، انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کا شمار ہوتا ہے۔ ان کی وجہ سے آج ہماری حیات خواب گاہ سے رزم گاہ تک بدلتی ہی جا رہی ہے۔ پورا عالم نوائے سروش ہے۔

الیکٹرونک میڈیا کی ترقیوں نے دنیا کو محوِ حیرت کر دیا ہے اور انسان یہ کہنے پر مجبور ہے کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔ موجودہ معاشرے کو اطلاعاتی معاشرہ یا اطلاعاتی دھماکے والا سماج کہا جا رہا ہے۔ اس معاشرے میں زندگی بسر کرنے والے کو سائبر مین کے نام نامی سے موسوم کیا گیا ہے۔

برقیاتی و تکنیکی تبدیلیوں سے معاشرہ دیکھتے دیکھتے ایک نئے روپ میں آ گیا ہے۔ پوری دنیا آج تکنیکی ترقی نے بدل کر رکھ دیا ہے۔ کمپیوٹر کی نعمتِ غیر مترقبہ نے دنیا کو مختصر کر دیا اور اس طرح انسانیت ایک نئے ہوش رُبا دور سے متعارف رہی ہے۔ اس عہد میں کتب و رسائل کی کیا اہمیت ہے؟

ماضی قریب میں مطالعہ وقت گزاری اور تفریح کا ایک مؤثر ذریعہ ہوا کرتا تھا۔ کتب اور رسائل قلبی اور روحانی سکون کا باعث ہوتے تھے۔ کتابوں نے ہی ملک اور قوم میں انقلاب برپا کیے۔ کتابوں سے ایک ثقافت وابستہ ہے۔ کتاب اور رسالے کے شوقین کو سماج میں ایک مُہذب طبقہ کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔

حالات اور زمانہ سُرعت کے ساتھ وسیع دنیا میں سمٹ گئے۔ الیکٹرونک میڈیا کے جال نے دنیا کو ایک گاؤں میں بدل کر رکھ دیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ کتابوں اور رسائل کا مواد دیدہ زیب انداز سے انٹرنیٹ پر موجود ہے۔ مگر جو بات کتاب یا جریدے یا اخبار کے مطالعے کی ہے وہ انٹرنیٹ پر ممکن نہیں اور نہ ہی اسے مطالعہ کہا جا سکتا ہے۔ ٹیلی ویژن، ریڈیو اور فلم غرض کہ جو بھی ذرائع ابلاغ سے متعلق ہے وہ تحریر اور کتاب کے محتاج ہیں۔ قلم اور قرطاس کا رشتہ کبھی تمام نہیں ہو سکتا۔ انٹرنیٹ پر لاتعداد ویب سائٹس کا قائم ہونا زندگی کی علامت ہے۔ دور جدید کا آدمی کتابوں او ررسائل کے اتنا ہی قریب ہے جتنا کہ گذشتہ صدی کا آدمی کتاب اور رسالے سے ہم رشتہ تھا۔

ریڈیو Spoken word کا میڈیا ہے۔ ریڈیو کی نشریات نے بھی کتابوں اور رسالوں کے مطالعے کو بے طرح متاثر کیا ہے۔ ریڈیو پر پہلے مخصوص پروگرام ہوتے تھے جن کو سامعین وقتِ مقررہ پر سماعت کیا کرتے تھے۔ وقت بدلا، زمانہ بدلا اور تہذیبیں بدلتی رہیں۔ ریڈیو زوال سے اٹھا او رہوا کے دوش پر 24 گھنٹے تفریحی پروگرام پیش کرنے لگا۔ ریڈیو پر دیگر زبانوں کے جہاں اچھے اچھے پروگرام پیش کیے جاتے ہیں وہیں ریڈیو سے اردو ادب کو بھی فروغ ملا۔ کئی بڑے لوگوں کی شناخت کا ذریعہ ریڈیو بنا۔ کئی بڑے فن کار اور نام ریڈیو کے ہی مرہون منت ہیں۔ ریڈیو پر اردو کی کتابوں اور رسائل پر باتیں ہوتی ہیں وہیں ریڈیو سے، کیا خوب آدمی تھا؟ یہ غلط بریں ارمانوں کی، زندگی اور زندگی، یہ داغ داغ اُجالا، شہرنامہ، شہر آرزو، خوشناسی، زاویہ نگاہ، صدائے ناتمام، دستِ صبا، حرف تابندہ، آبشار خیال، سب رنگ، نئی دنیا، شیرازۂ گل، کہکشاں اور اردو مجلس جیسے یادگار پروگرام جاری ہیں۔

ریڈیو کے تلاطم خیز انقلاب کے باوجود کتاب اور رسالے کی افادیت اس لیے متعین ہے کہ جو بھی پروگرام پیش کیا جا رہا ہے اس میں کتابیں اور جریدے ہی معاون ثابت ہو رہے ہیں۔

ٹیلی ویژن ایک سمعی اور بصری آلہ ہے۔ اس آلہ نے انسانی زندگی میں تحیّر خیز طوفان برپا کیا ہے۔ ٹی وی پر بے شمار چینلوں کا ایک جنگل قائم ہو گیا ہے۔ طرح طرح کے سیریل، نیوز اور بچوں کے لیے فلمیں شب و روز دکھائی جا رہی ہیں۔ ٹی وی پر پہلے کیبل لگانے کا فیشن چل پڑا تھا۔ اب تبدیلی ہو چکی ہے۔ سٹیلائیٹ سسٹم عام ہو رہا ہے۔ لیکن کتاب کی افادیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ ٹی وی پر بھی کئی پروگرامس بتائے جاتے ہیں۔ جس میں کتابوں اور رسائل کی اہمیت کے علاوہ دیگر اردو پروگرامس بتائے جاتے ہیں۔ کتابیات اور جرائد کی معنویت ٹیلی ویژن کے سامنے بھی مقدم ہے۔

فلم چاہے کسی بھی موضوع پر یا کسی بھی زبان میں ہو اس کا راست تعلق تحریر اور تخلیق سے ہی ہوتا ہے۔ فلم سے قبل اس کی اسکرپٹ کتابوں اور رسائل کی مدد سے ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ فلمستان کی نیرنگیاں بھی کتاب اور رسالے کے سامنے معدوم ہیں۔

کتابوں کی دنیا عشق چاہتی ہے۔ علم سے عشق ہوگا تو لامحالہ کتابوں سے عشق ہوگا۔ کتاب اور رسالہ سے محبت اور لگاؤ نہیں ہوگا تو معاشرہ، گونگا اور بہرہ ہو جائے گا۔ سکندر علی وجد نے لکھا ہے:

"کتابوں کا معاملہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ عشق چاہیے اور ساتھ ہی ساتھ علم

کا بھی عشق چاہیے۔ مگر اب علم بھی نہیں ہے اور عشق بھی نہیں۔ ہمارے گھروں میں ریڈیو ہے ٹیلی ویژن ہے سب کچھ ہے لیکن کتاب نہیں ہے۔"

امر واقعہ ہے کہ لفظ کتابوں کی قبر میں مردہ پڑے ہوئے ہیں اور دیمک کتابوں اور جرائد کو چاٹ رہی ہے۔ دنیا کو ارتقا کی زندگی کتاب ہی نے عطا کی ہے۔ الیکٹرونک کتاب اور الیکٹرونک تعلیم نے اپنے قدم جمانے کی کوشش کی ہے اس وقت کئی لاکھ کتابیں کمپیوٹر اسکرین پر ماؤس کی ایک کلک کے فاصلہ پر موجود ہیں۔ کئی کتابیں ایسی بھی ہیں جو صرف الیکٹرونک شکل میں موجود ہیں ان کی کاغذی شکل سرے سے دستیاب ہی نہیں ہے۔

الیکٹرونک کتاب کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ کم سے کم جگہ گھیرتی ہے۔ مثال کے طور پر انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کاغذی شکل میں پوری الماری گھیرے گی جب کہ الیکٹرونک شکل میں دو سی ڈیز میں سما جاتی ہے۔ کتابی شکل میں کاغذی کتابیں گھر یا دارالمطالعے میں رہ سکتی ہے۔ برخلاف اس کے الیکٹرونک کتاب، رسالہ یا تعلیم، ٹرین، بس، ہوائی جہاز، اور دیگر مقامات پر بھی بہ آسانی مطالعے میں آسکتی ہیں۔ کاغذی کتاب خاموش معلم ہے۔ جبکہ الیکٹرونک کتاب آواز اور باتصویر ہوتی ہے۔ الیکٹرونک مطالعہ تمام فوائد کے باوجود محدود طبقہ تک ہی ہے۔ کاغذی کتاب لامحدود، لامتناہی اور ناتمام سلسلہ رکھتی ہے۔ ہماری بھی رفیق کتاب ہی ہے۔ بقول عاشق کیرانوی

سرورِ علم ہے کیف شراب سے بہتر
کوئی رفیق نہیں ہے کتاب سے بہتر

لائبریری، قوموں کی علمی عظمت اور فکری بصیرت کا آئینہ دار ہوتی ہے۔ کتب خانے ہی وہ جگہ ہوتے ہیں جہاں اذہان کی تعمیر ممکن ہے۔ کتب خانوں کی کتب کو دیمک لگ گئی ہے۔ لائبریریوں کی حالت کی حقیقت سے چشم پوشی ناممکنات میں سے ہے۔ مطالعہ اور دارالمطالعہ ہی تہذیبی تحفظ کی کلید ہوتے ہیں۔ کاغذ لائبریری آہستہ آہستہ ختم ہوتی جارہی ہے اس کی جگہ ای لائبریری کا فروغ بڑھ گیا ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ فیس ادا کرکے کتابیں اور رسائل حاصل کیے جاتے تھے لیکن آج ای لائبریری میں کتابیں ہوں یا رسائل بلاقیمت دیکھے اور پڑھے جاسکتے ہیں۔

تحقیقی، علمی اور تعلیمی مواد انٹرنیٹ پر موجود ہے سوال کیا جاسکتا ہے کہ کیا ای لائبریری کے قاری موجود ہیں۔ جواب اس سوال کا یہی ہے کہ ہر فرد کے پاس انٹرنیٹ نہیں ہے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ کر کوئی چاہتا نہیں ہے کہ اپنا وقت ضائع کریں۔ کاغذی کتاب کی افادیت اور معنویت قائم ہے۔ کاغذی کتاب سے آپ آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر بھی مطالعہ کرسکتے ہیں۔ ای لائبریری سے زیادہ پرنٹ لائبریری ہی جاوداں رہ گئی۔ کتاب خانے انسان کی تہذیب کا پتہ دیتے ہیں اور کتابیں ہی کلچر کو آگے بڑھائیں گی۔ جاوید ناصر کا یہ شعر دارالکتب کی صحیح ترجمانی کررہا ہے:

گھنے جنگل میں باتیں ہورہی ہیں
کتابوں میں کتابیں رو رہی ہیں

تربیت کار اور معلمین کتابی تہذیب (Book Culture) میں رچے بسے ہوئے ہیں۔ ٹیلی ویژن کو تفریح طبع کا ایک آلہ تصور کرتے ہیں مگر اس کی تعلیمی جہت سے یکسرنا آشنا ہیں۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، فلم اور آڈیو کیسٹ وغیرہ تفریح طبع کے ساتھ کسی حد تک تعلیم و تعلم کا ذریعہ بھی بنتے جارہے ہیں جدید تکنیکی، سائنس کے عمل دخل سے تعلیم کے نئے نئے طریقۂ کار سامنے آئے ہیں۔ جو روایتی طریقۂ کاروں سے بالکل مختلف ہیں۔ ذرائع ابلاغ کی دین استاد اور طالب علم کے لیے مفید ثابت ہورہی ہے۔

ذرائع ابلاغ کے عصر میں کتاب اور رسالہ کی اہمیت دائمی ہے۔ کتاب اور رسالہ ہی تہذیبی اور لسانی سطح پر رابطہ کا کام کرتے ہیں۔ پرنٹ میڈیا کا جادو اب تک بھی سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ متاع لوح و قلم چھین بھی جائیں تو کیا، کتاب اور رسالے تو باقی رہیں گے اور تہذیب کا دفاع کریں گے۔
حضرت امام جعفر صادق فرماتے ہیں:

"لکھو! اور اپنے علم کو اپنے دوستوں کے درمیان پھیلاؤ اور جب وقتِ مرگ آئے تو اپنے بچوں کو بطور میراث سپرد کرو کہ جب فتنہ و آشوب کا زمانہ آتا ہے تو بجز کتاب کوئی اور مونس و دم ساز نہیں ہوتا۔"

کتب اور رسائل کا معدوم ہوجانا اپنی ہستی کو ختم کرنے کے مترادف ہوگا۔ کتب اور رسائل کا مطالعہ کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ تو نہیں ہوا ہے اگرچہ کتب اور رسائل نت نئے رنگوں میں شائع ہورہے ہیں اور اس کی افادیت میں کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ دُھند کی فضا کتاب اور رسالہ پر چھائی ہوئی ہے۔ مگر کتب و رسائل ذرائع ابلاغ کے دور میں بھی اپنی معنویت اور افادیت رکھتے ہیں کیونکہ کتاب صدیوں کا حافظہ ہوتی ہے۔ کتب اور رسائل جب تک زندہ رہیں گے جب تک انسان کی سانس میں سانس ہے اور یہ حقیقت کے ساتھ بھی:

حواشی:

کتابیں اور رسائل
عوامی ذرائع ابلاغ ترسیل اور تعمیر و ترقی
دیویندر اسر
اردو زبان کے فروغ میں ریڈیو، ٹیلی ویژن کا حصہ
ڈاکٹر حسام الدین فاروقی
الیکٹرونک میڈیا ریڈیو— ٹیلی ویژن
محمد امتیاز علی تاج
ماہنامہ آجکل نئی دہلی اردو کتابوں کے مسائل 1996
ماہنامہ رفیق منزل دہلی مطالعہ نمبر 2001

□□□

عبدالودود انصاری

اردو میں شائع ہونے والے سائنسی اور طبی رسالے

کسی قوم کی ترقی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی زبان میں کتنے رسالے شائع ہو رہے ہیں اور اس کے پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے۔ رسالے چاہے ادبی ہوں، سائنسی ہوں یا طبی ان کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ رسالے معلومات کا خزانہ ہوتے ہیں جس کے ذریعے انسان اپنے علم میں اضافہ کرتا ہے۔ رسالے مشکل سے مشکل مضامین آسان اور قابل فہم انداز میں پیش کرتے ہیں۔ سائنسی رسالوں کا مطالعہ اس وجہ سے ضروری ہے کہ انسان ان کے ذریعے فطرت کے سربستہ رازوں سے واقف ہوتا ہے، نت نئی دریافتوں سے آگاہ ہوتا ہے اور دنیا کی ترقی کی رفتار سے آشنا ہوتا ہے۔ طبی رسالوں سے مختلف بیماریوں کی جانکاری ہوتی ہے۔ بیماریوں کی وجوہات اور علاج و معالجہ کا علم ہوتا ہے۔ طبی رسالوں کے مطالعہ سے حفظ ماتقدم کے طور پر انسان بہت ساری بیماریوں سے نجات پاکر صحت مند اور مسرت آمیز زندگی پانے میں کامیاب بھی ہوتا ہے۔

یہاں ہم ہندوستان کے مختلف گوشوں سے شائع ہونے والے سائنسی اور طبی رسالوں کا تعارف پیش کر رہے ہیں۔

1. سائنس کی دنیا

صفحات: 52، مدت: سہ ماہی، مقام اشاعت: نئی دہلی

قیمت: 10 روپے، زر تعاون: ایک سال کے لیے: 30 روپے، دو سال کے لیے: 50 روپے، تین سال کے لیے: 60 روپے

اڈیٹر: ڈاکٹر رویندر کمار، ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتا:

Science Ki Duniya
National Institute of Science, Communication & Information Resources (CSIR), Dr. Krishnan Marg (Near Pusa Gate), New Delhi-110012

فون نمبر: 011-25848702

ای میل: rkumar@niscair.res.in

نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کمیونی کیشن اینڈ انفارمیشن ریسورسیز کی جانب سے جاری ہونے والا رسالہ ''سائنس کی دنیا''، مسلسل 34 سال سے شائع ہو رہا ہے۔ یہ رسالہ ہندوستان میں سب سے زیادہ مقبول عام ہے۔ اس میں لکھنے والے زیادہ تر سائنس داں اور اعلیٰ ڈگری والے مصنف ہوتے ہیں۔ رسالہ میں بچوں اور خواتین کے لیے بھی مضامین ہوتے ہیں اس کے سوا سائنسی کوئز، سائنسی سوالات اور سائنسی خبریں بھی ہوتی ہیں۔ سائنسی کتابوں پر تبصرے بھی کیے جاتے ہیں اور قارئین کے آرا کو بھی جگہ دی جاتی ہے۔ آخری صفحات پر رسالے کے مضامین کے مشکل الفاظ کے معنی اور ان کے انگریزی مترادفات کے عنوان شامل رہتے ہیں۔ سائنس کی دنیا نے اپنی طویل تر مدت میں کئی قیمتی اور کارآمد نمبر بھی شائع کیے ہیں۔ حکومت کی جانب سے شائع ہونے کی وجہ سے اس کی قیمت نہایت ہی کم ہے۔

2. اردو سائنس

صفحات: 56، مدت: ماہنامہ، مقام اشاعت: نئی دہلی

قیمت: 20 روپے، زر تعاون سالانہ: 200 روپے،

اعانت تاعمر: 3000 روپے

اڈیٹر: ڈاکٹر محمد اسلم پرویز، ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتا:

Urdu Science Monthly
665/12, Zakir Nagar, New Delhi-110025

فون نمبر: 93127-07788، فیکس نمبر: 23215906 (0091-11)

ای میل: parvaiz@ndf.vsnl.net.in

یہ رسالہ اسلامی فاؤنڈیشن برائے سائنس اور ماحولیات نیز انجمن فروغ سائنس کے نظریات کا ترجمان ہے جو مسلسل چودہ برسوں سے شائع ہو رہا ہے۔ یہ ہندوستان کا پہلا سائنسی اردو رسالہ ہے جس میں ڈائجسٹ، لائٹ ہاؤس، میراث اور انسائیکلوپیڈیا کے عنوانات کے تحت سائنسی مضامین ہوتے ہیں۔ میزان کے عنوان سے سائنسی کتابوں پر تبصرے بھی کیے جاتے ہیں اور ردِ عمل کے عنوان سے قارئین کے خطوط شائع کیے جاتے ہیں۔ اس کے مختلف شماروں میں سائنسی نظمیں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس رسالے نے سائنس اور اسلام کے رشتے کو قریب لانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مزید اس نے سائنسی مضامین لکھنے والوں کے لیے ایک ایسا اسٹیج فراہم کیا ہے جس کے ذریعے نئے نئے سائنسی ادیب

منصۂ شہود پر ابھر کر اپنے قلمی تعاون سے سائنسی اردو ادب کو مالا مال کررہے ہیں۔ اس رسالے نے اپنی چودہ سالہ مدت میں ایسا سائنسی خزانہ جمع کردیا ہے جس کی مثال ماضی میں نہیں ملتی ہے۔

3. سائنس اور کائنات

صفحات:8، مدت: ماہنامہ، مقام اشاعت: علی گڑھ،

قیمت:6 روپے، زر تعاون سالانہ:60 روپے

اڈیٹر: اسعد فیصل فاروقی، زر تعاون اور خط و کتابت کا پتا:

Science Aur Kainat
Allah Wali Kothi, Dodhpur, Civil Line,
Aligarh-202002

موبائل نمبر:9412595891

ای میل:scienceaurkainat@rediffmail.com

ہندوستان کا واحد سائنسی اخبار ''سائنس اور کائنات'' مسلسل تین سال سے شائع ہورہا ہے۔ یہ اخبار سائنس، ماحولیات اور صحت کا ترجمان ہے۔ اس میں سائنسی مضامین کے سوا سائنسی خبریں اور سائنسی کتابوں پر تبصرے بھی ہوتے ہیں۔ اخبار کی قیمت اتنی کم ہے کہ ہر کوئی خرید کر پڑھ سکتا ہے۔

4. میڈیکل زون

صفحات، 94، مدت: ماہنامہ، مقام اشاعت: بنگلور، قیمت:30 روپے

زر تعاون سالانہ:300 روپے

اڈیٹر: ڈاکٹر سی وائی ایس خان، ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتا:

Medical Zone, Gem Enclave,
7th Main, Opp. R.T. Nagar Post Office,
Bangalore-560032

فون نمبر:080-553475486، فیکس نمبر:080-23335391

یہ رسالہ میڈیکل شعبے کی جدید معلومات سے مزین ہے اس کے سوا اس کے اندر انسانی جسم، پرندے، جانور، سانپ، مچھلی اور کہکشاں کے متعلق بیش بہا مواد موجود ہوتے ہیں۔ ماضی کی مشہور شخصیتوں مثلاً جولیس سیزر، قلوپطرہ، واسکوڈ گاما اور سرایڈمنڈ ہلاری وغیرہ کے تعارف تصویر کے ساتھ شامل کیے جاتے ہیں۔ رسالے میں کسی ایک عظیم سائنس داں کی سوانح عمری کے ساتھ ان کی سائنسی خدمات کا ذکر ہوتا ہے۔ رسالے میں سائنسی سوال و جواب کا کالم بھی شامل ہے۔ لڑکے اور لڑکیوں کے رشتوں کے لیے دو صفحات بھی مخصوص ہوتے ہیں۔ رسالے کے آخری چند صفحات میں انگریزی میں سائنسی مضامین شامل کیے جاتے ہیں۔ رسالہ ''حمل نمبر'' شائع کرچکا ہے اور ''ذیابیطس نمبر'' شائع کرنے کا اعلان کیا ہے۔ یہ رسالہ اردوداں کے مطالعے کے لیے نہایت ہی مفید ہے کیوں کہ اس کے فراہم کردہ معلومات کی مدد سے انسان حفظ ماتقدم کے طور پر نت نئی بیماریوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔

5. نقش میڈیکل

صفحات:84، مدت: سہ ماہی، مقام اشاعت: پونہ، قیمت:25 روپے، زر تعاون سالانہ:100 روپے

اڈیٹر: قاسم زبیری، ترسیل وزر و خط و کتابت کا پتا:

Naqsh-e-Medical
National Anglo Urdu High School,
Kharadwadi, Pimpri-411018

فون نمبر: 020-27424930، موبائل نمبر: 9422302292

ای میل:urduco@sancharnet.in

رسالہ ''اردو کونسل''، پونہ کی جانب سے شائع ہوتا ہے جو فی الحال سہ ماہی ہے لیکن مستقبل کے لیے ماہنامہ کا اعلان ہے۔ تمام موضوعات طب سے تعلق رکھتے ہیں۔ مختلف بیماریوں پر مضامین مع تصویر شامل ہیں۔ رسالے میں ماضی کے مسلمان سائنس دانوں کی خدمات کو بھی اُجاگر کیے جاتے ہیں۔ رسالے کے آخری چند صفحات میں مضامین انگریزی میں شامل ہیں۔ رسالہ کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں ہے۔

6. فکر صحت

صفحات:60، مدت: ماہنامہ، مقام اشاعت: رام پور (یوپی)

قیمت:20 روپے، زر تعاون سالانہ:200 روپے

اڈیٹر: محمد عاصم راجہ، ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتا:

Fikr-e-Sehat
Janata Market, Rampur-244901 (U.P.)

فون نمبر: 0595-2341293

موبائل نمبر: 9837432353, 9837215082

رسالہ پچھلے بارہ سال سے شائع ہورہا ہے۔ اس کی اشاعت کا مقصد شعور صحت کی بیداری اور صحت سے متعلق معلومات فراہم کرنا ہے۔ رسالہ صحت اور میڈیکل سائنس سے متعلق مضامین پیش کرتا ہے اس کے علاوہ اس میں سماجی بیداری کے سلسلے سے بھی مضامین ہوتے ہیں۔ آخری صفحات پر اخبار صحت کے عنوان سے طبی خبریں ہوتی ہیں۔

7. الشفاء

صفحات:68، مدت: ماہنامہ، مقام اشاعت: نئی دہلی،
قیمت:20 روپے، زرتعاون سالانہ:240 روپے،
اعانت تاعمر: 5000 روپے
اڈیٹر: سید اعجاز حسین، ترسیل زر وخط وکتابت کا پتا:

Al Shifa
2075, Kucha Chelan, Daryaganj,
New Delhi-110002

فون نمبر: 011-23253268، موبائل نمبر: 09899044813

صحت عامہ سے متعلق الشفاء 15 سالوں سے شائع ہو رہا ہے۔ رسالہ میں طب کے مختلف عنوانات سے مضامین ہوتے ہیں۔ پھل، سبزی اور دیگر قدرتی اشیاء پر معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ رسالے میں قرآن اور احادیث کی روشنی میں مختلف بیماریوں کے علاج کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ آخری صفحات پر میڈیکل نیوز کے عنوان سے طبی دنیا کی پیش رفت کی جانکاری فراہم کی جاتی ہے۔ رسالے کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس کے صفحات کی پیشانی پر قیمتی اقوال لکھے ہوتے ہیں۔ رسالے میں مختلف کمپنیوں کی دواؤں کے اشتہارات بھی ہوتے ہیں۔

8. جہانِ طب

صفحات:64، مدت: سہ ماہی، مقام اشاعت: نئی دہلی،
قیمت:50 روپے، زرتعاون سالانہ، 200 روپے
اڈیٹر وڈائرکٹر: حکیم محمد خالد صدیقی، ترسیل زر وخط وکتابت کا پتا:

Director
Central Council for Research in Unani Medicine
61-65, Institutional Area, Janak Puri,
New Delhi-110058

فون نمبر:28525852 - 28525831-(011)
28525862 - 28525883 - 28525897
فیکس نمبر:28522965--1-9+
ای میل: cerum@del3.vsl.net.in
ویب سائٹ: http/www.cerum.net

سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن (وزارت صحت و خاندانی بہبود)، حکومت ہند کی جانب سے یہ رسالہ گذشتہ آٹھ سال سے شائع ہو رہا ہے۔ یہ رسالہ خالص طبی رسالہ ہے جس میں ملک و بیرون ملک کے نامور اطبا کے مضامین مختلف عنوان سے شائع ہوتے ہیں۔ جہانِ طب کے کئی ضخیم نمبر مثلاً ابن سینا نمبر، تکمیل الطب کالج نمبر، رازی نمبر، حکیم افتخار الحق تکمیلی نمبر، سلور جبلی نمبر اور یونانی میڈیکل کالج، الہ آباد نمبر وغیرہ شائع ہو چکے ہیں۔ اس رسالے سے اطبا حضرات ہی زیادہ مستفیض ہوتے ہیں۔

9. نوائے طب وصحت

صفحات:40، مدت: سہ ماہی، مقام اشاعت: الہ آباد،
قیمت:16 روپے، زرتعاون سالانہ:60 روپے،
اعانت تاعمر:1000 روپے
اڈیٹر: حکیم محمد عرفان نجف علیمی، ترسیل وزر وخط وکتابت کا پتا:

Nawa-e-Tib-o-Sehat
P.O. Begum Sarai, Allahabad - 211015

موبائل نمبر: 9935289962
ای میل: nito.sehat@yahoo.com

یہ طب کا جامع رسالہ پندرہ سال سے شائع ہو رہا ہے۔ پورا شمارہ طبی معلومات پر مشتمل ہوتا ہے۔ رسالے میں دواؤں کے اشتہارات بھی ہوتے ہیں۔ نقد ونظر کے عنوان سے طبی کتابوں پر تبصرے کیے جاتے ہیں۔

10. ترجمان اصلاحی

صفحات: 28، مدت: ماہنامہ، مقام اشاعت: ممبئی، قیمت:10 روپے،
زرتعاون سالانہ:100 روپے
اڈیٹر: حکیم محمد طارق اصلاحی، ترسیل زر وخط وکتابت کا پتا:

Tarjumane Islahi
Islahi Dawakhana, 170, Fancy Mahal,
Mohd. Ali Road, Mumbai-03

فون نمبر: 2374601، موبائل نمبر: 9870799757
ای میل: islahidawakhana@hotmail.com

یہ رسالہ طبی اور سماجی ماہنامہ ہے جو پچھلے چار برسوں سے اصلاحی دواخانہ شائع کر رہا ہے۔ رسالے میں یہ طبی، ادبی اور دینی مضامین ہوتے ہیں۔ ''حکیم صاحب سے پوچھیے'' کے عنوان سے مختلف بیماریوں کے سلسلے سے کیے گئے سوالات کے جوابات ہوتے ہیں۔ آخری صفحہ پر ''خبرنامہ اصلاحی'' کے تحت طبی خبریں ہوتی ہیں۔ رسالے میں جگہ جگہ طبی دواؤں کے اشتہارات ہوتے ہیں۔

12. ہمدرد

صفحات: 32، مدت: ماہنامہ، مقام اشاعت: نئی دہلی، قیمت:1 روپے

اڈیٹر: حماد احمد

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتا:

Hamdard Monthly
2A/3, Asif Ali Road, Hamdard Building
New Delhi-110002

فون نمبر: (011) - 3239804 - 3239803

3239802 - 3239801

فیکس نمبر: 91-11-3239805

یہ رسالہ ہمدرد (وقف) کا ترجمان ہے جس کو جناب حکیم عبدالحمید مرحوم نے جاری کیا تھا۔ رسالے میں مختلف بیماریوں کی تفصیل دی جاتی ہے۔ رسالے کے آدھے حصے میں اردو میں مضامین ہوتے ہیں اور آدھے حصے میں ہندی مضامین۔ قاریوں کی جانب سے پوچھے گئے بیماریوں کے علاج اور پرہیز بھی بتائے جاتے ہیں۔

13. مسائل دین ودنیا اور طب

صفحات: 56، مدت: ماہنامہ، مقام اشاعت: نئی دہلی،

قیمت: 18 روپے، زرتعاون سالانہ: 210 روپے

مدیر: طٰہٰ نسیم، ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتا:

Masail-e-Decno Duniya Aur Tib
2872-74, Kucha Chelan, Daryaganj,
New Delhi-110002

فون نمبر: 011-23253514 & 011-23286551

فیکس نمبر: 23277913

ای میل: islamic@eth.net

یہ رسالہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں دینی معلومات، دوسرے حصے میں معلوماتی مضامین اور تیسرے حصے میں طب کے متفرق عنوانات سے مضامین ہوتے ہیں۔ رسالہ میں خبرنامۂ صحت کے عنوان سے دنیائے طب کی خبریں ہوتی ہیں اور کتابوں پر تبصرے بھی کیے جاتے ہیں۔

14. بخشیات

صفحات: 8، مدت: پندرہ روزہ، مقام اشاعت: کولکاتہ، قیمت: 3 روپے، زرتعاون سالانہ: 65 روپے

مدیر: حکیم محمد یوسف، ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتا:

Bakhshiyat
32, Moulana Shaukat Ali Street,
P.O. Box No. 12330, Kolkata-700073

فون نمبر: (033) - 22377646

ای میل: bakhshiyat@rediffmail.com

یہ اخبار آٹھ صفحات پر مشتمل ہے جو کولکتا کی بخشیات کمپنی کی جانب سے مسلسل 38 سالوں سے شائع ہوتا چلا آرہا ہے۔ اس اخبار میں طب پر مضامین ہوتے ہی ہیں اس کے علاوہ دینی، اصلاحی اور ادبی مضامین بھی ہوتے ہیں۔

15. فیصل ہند

صفحات: 52، مدت: ماہنامہ، مقام اشاعت: نئی دہلی

قیمت: 12 روپے، زرتعاون سالانہ: 120 روپے

اڈیٹر: نوید صدیقی، ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتا:

Faisal Hind
468, Gali Bahar Wali, Chatta Lal Mian,
Daryaganj, New Delhi-110002

فون نمبر: 011-23245665، ویب سائٹ: www.faisal.co.in

یہ رسالہ مسلسل سات برس سے شائع ہو رہا ہے۔ اس رسالے میں دینی، معلوماتی اور اخلاقی مضامین کے ساتھ ساتھ طبی مضامین بھی شائع ہوتے ہیں۔

□□□

پتہ:

Urdu Medium Govt. Teachers
Training Institute, P.O. Nalikul-712407 (W.B.)

بہادری کے کارنامے

مصنف: منوج داس / مترجم: ایس۔ ایم۔ احمد

ہمارے ملک کو انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے لاتعداد قربانیاں دینی پڑی ہیں۔ جن سورماؤں نے اپنی جان آزادیٔ وطن کے لیے نچھاور کی، ان کی ایک طویل فہرست ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں جدوجہدِ آزادی کے ابتدائی دور کے ایسے ہی بہادر سپوتوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

صفحات: 83، قیمت -/25 روپے

نسیم احمد

کلاسیکی ادب

خواجہ میر درد اور ان کا کلام

خواجہ میر نام اور درد تخلص تھا۔ سلسلۂ محمدیہ نقشبندیہ کی مناسبت سے میر محمدی بھی کہے جاتے تھے۔ 19 ذی قدہ 1133ھ یکم اکتوبر 1721 کو دہلی کے ایک معزز و محترم خانوادے میں پیدا ہوئے۔ اور ان کا انتقال 24 صفر 1199ھ 6 جنوری 1785 کو ہوا۔ نسب کے اعتبار سے نجیب الطرفین سید تھے۔ خود ان کے بیان کے مطابق ان کا شجرۂ نسب والد کی طرف سے گیارہ واسطوں سے خواجہ بہاء الدین نقشبند اور پچیس واسطوں سے حضرت امام عسکری سے جا ملتا ہے۔

خواجہ میر نے اپنے والد بزرگوار کی آغوشِ تربیت میں پرورش پائی۔ ابتدائی تعلیم اِنھی کی زیرِ نگرانی حاصل کی اور علومِ رسمیہ سے آگاہ ہوئے۔ بہ قول خود "وسط جوانی میں عقائد، معقولات اور اصولِ تصوف وغیرہ بہ قدرِ ضرور" سیکھے۔ حکیم قدرت اللہ قاسم پہلے تذکرہ نگار ہیں جنھوں نے کسی بزرگ مفتی دولت مرحوم کی خدمت میں حاضر ہو کر چند ماہ فنونِ رسمیہ سیکھنے کی اطلاع دی ہے۔ قاسم کے الفاظ یہ ہیں: "...ماہے چند از خدمت افادت مرتبت مفتی دولت مرحوم مغفور مر اکتساب فنونِ رسمیہ ہمت گداشت...."

بعد کے تذکرہ نگاروں میں گارساں دی تاسی اور لالہ سری رام نے قاسم کے بیان کا اعادہ کیا ہے جب کہ محمد حسین آزاد نے کئی ماہ تک مفتی دولت مرحوم سے مثنوی روم کا درس لینے کی بات کہی ہے۔ ناصر نذیر فراق کا بیان ہے کہ درد نے فارسی کے لیے سراج الدین علی خاں آرزو اکبرآبادی کی صحبت اختیار کی تھی۔ سراج الدین علی خاں آرزو نے جب شعرائے فارسی کا تذکرہ "مجمع النفائس" مرتب کیا (1164ھ 51-1750) تو اس میں خواجہ میر درد کو نمایاں طور پر جگہ دی۔

غلام حسین شورش عظیم آبادی بھی درد کے معاصر ہیں انھوں نے اپنے تذکرے میں درد کے مروجہ دیوان کے اشعار کی تعداد "قریب ہزار" بتائی ہے اور ان کی شاعرانہ خوبیوں کا اعتراف بھی کیا ہے۔

خواجہ میر درد بہ یک وقت شاعرِ بے مثل، صوفی باصفا اور عالمِ باعمل بزرگ تھے۔ مزاج کو شاعری اور تصنیف و تالیف سے فطری مناسبت تھی۔ یہ ذوق انھیں اپنے والد بزرگوار خواجہ ناصر عندلیب سے ورثے میں ملا تھا اور برادرِ خورد خواجہ میر اثر کی فرمائشیں برابر اس طبعی رجحان اور فطری ذوق کو مہمیز کرتی رہتی تھیں، چنانچہ ان کی تصانیف کا بیشتر حصہ انھی کی فرمائشوں کا نتیجہ ہے۔ اب تک درد کی کل نو کتابوں کا پتا چل سکا ہے جن میں اردو اور فارسی کے دو مختصر دیوان بھی شامل ہیں۔ ان دواوین کے علاوہ، باقی کتابیں یہ ہیں:

(1) اَسرار الصلوٰۃ: یہ مختصر رسالہ خواجہ میر درد کی پہلی تصنیفی کاوش ہے جسے انھوں نے بہ حالتِ اعتکاف پندرہ برس کی عمر میں 1147ھ 36-1735 میں تحریر کیا تھا۔ اس کا ذکر سب سے پہلے "آبِ حیات" میں ملتا ہے۔ پندرہ صفحوں کا یہ رسالہ "صلوٰۃ" یعنی نماز کے ارکان ہفت گانہ پر مشتمل ہے۔

(2) واردات: خواجہ میر درد کی دوسری اور اہم تصنیف ہے۔ اس میں قلبی مشاہدات ذاتی کیفیات اور صوفیانہ تجربات کو رباعیوں کی شکل میں نثری تشریحات و تعلیقات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ بہ الفاظ دیگر یہ کتاب اصلاً فارسی رباعیوں کا مجموعہ ہے۔

(3) علم الکتاب: درد کی یہ ضخیم ترین اور معرکہ آرا تصنیف بنیادی طور پر "واردات" کی مفصل شرح ہے۔ اس کتاب میں تصوف کی تائید و حمایت میں قرآنی آیات، احادیث نبوی اور سلف کے اقوال سے دلیلیں پیش کی گئی ہیں۔

(4) نالۂ درد: "علم الکتاب" کی تکمیل کے بعد درد نے ایک اور رسالہ "نالۂ درد" کے نام سے تصنیف کیا اس کے مصنف تو بجا طور پر میر درد ہیں لیکن مرتب ان کے چھوٹے بھائی میر اثر ہیں۔ درد نے دیباچۂ کتاب میں اس کی تصنیف کی روداد مختصراً یوں بیان کی ہے: "علم الکتاب" کے ختم ہونے پر جو منتشر خیالات و مطالب قلب غیر مطمئنہ پر تراوش کرتے تھے انھیں ناچار بے اختیار لکھ لیا کرتا تھا۔ اثر نے ان خیالات کو یکجا کر کے مرتب کیا اور "نالۂ درد" نام تجویز کیا۔

(5) آہ سرد: "نالۂ درد" کو مکمل کرنے کے بعد درد "آہ سرد" کی تصنیف کی طرف متوجہ ہوئے۔ اول الذکر کتاب کی طرح اس میں بھی تین سو اکتالیس (341) "سرد آہیں" ہیں اسے بھی خواجہ میر اثر ہی نے مرتب کر کے درج ذیل قطعۂ تاریخ تحریر کیا۔

(6) الف: شمع محفل ب: درد دل: "آہ سرد" کی تکمیل (1193ھ) کے بعد درد نے ان دونوں کتابوں کو ایک ساتھ شروع کیا۔ "شمع محفل" میں حسب سابق لفظ "ناصر" کے اعداد کی مناسبت سے تین سو اکتالیس (341) "نور" اور "درد دل" میں اتنے ہی "درد" شامل ہیں۔ ان دونوں کتابوں کے مرتب بھی خواجہ میر اثر ہیں۔

(دیوانِ درد، مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، جولائی، ستمبر 2003، مرتبہ ڈاکٹر نسیم احمد، سے ماخوذ)

انتخابِ کلامِ خواجہ میر درد

○

اگر یوں ہی یہ دل ستاتا رہے گا
تو اک دن مرا جی ہی جاتا رہے گا
میں جاتا ہوں دل کو ترے پاس چھوڑے
مری یاد تجھ کو دلاتا رہے گا
گلی سے تری، دل کو لے تو چلا ہوں
میں پہنچوں گا جب تک یہ آتا رہے گا
جفا سے غرض امتحانِ وفا ہے
تو کہہ، کب تلک آزماتا رہے گا
قفس میں کوئی تم سے اَے ہم صفیرو!
خبر گل کی، ہم کو سُناتا رہے گا
خفا ہو کے، اَے درد! مر تو چلا تو
کہاں تک غم اپنا چھپاتا رہے گا

○

انداز وہ ہی سمجھے مرے دل کی آہ کا
زخمی جو کوئی ہُوا ہو کسی کی نگاہ کا
زاہد کو ہم نے دیکھ لیا ہوں نگیں بہ عکس
رَوشن ہُوا ہے نام تو اُس رُو سیاہ کا
ہر چند فِسق میں تو ہزاروں ہیں لذّتیں
لیکن عجب مزہ ہے فقط جی کی چاہ کا
رحمت قدم نہ رنجہ کرے گر تری اِدھر
یارب! ہے کون پھر تو ہمارے گناہ کا
دل! اُس مژہ سے رکھیو نہ تو چشمِ راستی
اَے بے خبر! بُرا ہے یہ فِرقہ سپاہ کا
سو بار دیکھیاں ہیں تری بے وفائیاں
تِس پر بھی بہت غرور ہے دل میں نِباہ کا
اے درد! چھوڑتا ہی نہیں مجھ کو جذبِ عشق
کچھ کہربا سے چل نہ سکے برگِ کاہ کا

○

ہم نے کس رات نالہ سر نہ کیا
پر، اُسے آہ! کچھ اثر نہ کیا
سب کے ہاں تم ہوئے کرم فرما
اِس طرف کو کبھو گذر نہ کیا
کیوں بھویں تانتے ہو، بندہ نواز!
سینہ کس وقت میں سپر نہ کیا
کتنے بندوں کو جان سے کھویا
کچھ خدا کا بھی تو نے ڈر نہ کیا
دیکھنے کو رہے ترستے ہم
نہ کیا رحم تو نے پر نہ کیا
آپ سے ہم گزر گئے کب کے
کیا ہے، ظاہر میں گو سفر نہ کیا
کون سا دل ہے وہ کہ جس میں آہ
خانہ آباد! تو نے گھر نہ کیا
تجھ سے ظالم کے سامنے آیا
جان کا میں نے کچھ خطر نہ کیا
سب کے جوہر نظر میں آئے درد!
بے ہُنر! تو نے کچھ ہنر نہ کیا

رباعیاں

پیری چلی اَور گئی جوانی اپنی
اَے درد! کہاں ہے زندگانی اپنی
کل اَور کوئی بیاں کرے گا اِس کو
کہتے ہیں اب آپ ہم کہانی اپنی

تیرے لیے درد کو کسی سے نہ بنی
بہتیروں نے چاہا پہ سبھی سے نہ بنی
یہ خانہ خراب رَفتہ رَفتہ آخر
ایساب گڑا کہ اپنے جی سے نہ بنی

○

قتلِ عاشق، کسی مَعشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر، ترے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا
رات مجلس میں ترے حُسن کے شعلے کے حضور
شمع کے مُنہ پہ جو دیکھا تو کہیں نُور نہ تھا
ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحاً لیکن
میں نے پوچھا، تو کہا خیر، یہ مذکور نہ تھا
باوجودے کہ پر و بال نہ تھے آدم کے
وھاں یہ پہنچا کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا
پَرورش غم کی ترے یھاں تئیں تو کی، دیکھا
کوئی بھی داغ تھا سینے میں، کہ ناسور نہ تھا؟
محتسب! آج تو مَے خانے میں تیرے ہاتھوں
دل نہ تھا کوئی کہ شیشے کی طرح چُور نہ تھا
درد کے ملنے سے، اَے یار! بُرا کیوں ملنا
اُس کو کچھ اور سوا دید کے منظور نہ تھا

○

اپنا تو نہیں یار مَیں کچھ، یار ہوُں تیرا
تو جس کی طرف ہووے، طرف دار ہوُں تیرا
کُڑھنے پہ مرے، جی نہ کُڑھا، تیری بلا سے
اپنا تو نہیں غم مجھے، غم خوار ہوُں تیرا
تو چاہے نہ چاہے، مجھے کچھ کام نہیں ہے
آزاد ہوُں اِس سے بھی، گرِفتار ہوُں تیرا
ہے عشق سے میرے یہ ترے حُسن کا شُہرہ
مَیں کچھ نہیں، پر، گرمیِ بازار ہُوں تیرا
میری بھی طرف تو کبھو آ جا مرے یوسُف!
بُڑھیا کی طرح مَیں بھی خریدار ہوُں تیرا
اَے درد! مجھے کچھ نہیں اب اَور تو آزار
اُس چشم سے کہہ دینا کہ بیمار ہوُں تیرا

جاوید احمد کامٹوی

اطلاعاتی ٹیکنالوجی اور تدریس و تعلیم

ہندوستان قدیم زمانہ سے ہی علم و دانش اور مذہب و فلسفے کا گہوارہ رہا ہے۔ ماضی میں آبادیوں سے دور ''گروکل آشرم'' میں استاد ساری دنیا سے بے نیاز اور ستائش و صلے سے بے پروا ہوکر اپنے طلبہ کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا کرتے تھے۔ پڑھنے لکھنے کے علاوہ فن حرب اور دیگر شعبوں میں اپنے طالب علموں کو صحیح معنوں میں عملی زندگی کی تربیت دیا کرتے اور یہ طالب علم پوری طرح تیار ہوکر میدان زندگی میں داخل ہوتے۔ بعد کے زمانے میں تدریس کے لیے باقاعدہ اسکول قائم کیے گئے اور اب تو علم اور معلومات کے میدان میں ٹیکنالوجی دھماکے نے علم و فنون میں نئے ابواب قائم کیے ہیں۔

سائنس، ٹیکنالوجی کے میدان میں زبردست ترقی کے نتیجے میں ہماری زندگی کا ہر گوشہ ان سے متاثر ہوا ہے۔ سبھی علوم پر سائنسی نظریات و تحقیقات کی روشنی میں نظر ثانی کی گئی ہے، درس و تدریس کا میدان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رہا بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ساری دنیا میں سائنسی ترقی نے درس و تدریس، امتحانات کے نظام اور اس درس گاہوں کے تصور کو یک سر بدل کر رکھ دیا ہے۔ اطلاعاتی ٹیکنالوجی نے رہی سہی کسر پوری کردی۔ اس میدان میں محض چند برسوں میں آئی ترقیات نے درس و تدریس مدرسوں اور درس گاہوں کو خوب فیض پہنچایا۔

کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی بدولت آج ساری دنیا سکڑ کر ایک عالمی گاؤں بن چکی ہے۔ دنیا کے کسی بھی گوشے میں ہونے والی ہلکی سی تبدیلی لمحوں میں ساری دنیا میں گردش کرنے لگتی ہے۔ اب تو مغربی دنیا میں روایتی کتابوں، روایتی کلاس روم بلکہ روایتی اساتذہ کا تصور دھیرے دھیرے ختم ہو رہا ہے۔ انٹرنیٹ اور دیگر گیجیٹس (Gadgets) نے آج ان کی جگہ لے لی ہے۔ لیپ ٹاپ کی شکل میں کلاس روم اور ٹیچر اس کے سفر و حضر کا ساتھی بن چکا ہے جس میں محض ماؤس کی ایک کلک سے کسی بھی مطلوبہ معلومات یا رابطے کو کسی جن کی طرح حاضر کیا جاسکتا ہے۔ ان اشیا کا عمل دخل اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ آج ''جاہل'' اور ناخواندہ کی تعریف بدل چکی ہے۔ کمپیوٹر کے اس دور میں آج وہ شخص ناخواندہ نہیں جسے حرفوں اور ہندسوں کی پہچان نہ ہو بلکہ ناخواندہ وہ شخص ہے جو کمپیوٹر کی بنیادی معلومات سے بے بہرہ ہو۔ دنیا کا کون سا ایسا مضمون یا موضوع ہے، جو انٹرنیٹ پر موجود نہیں۔ گوگل سرچ انجن کی مدد لیتے جایئے اور علم کی نئی دنیاؤں کی کھوج کرتے چلے جایئے۔ یہ معلومات ایک دم جدید او رتازہ ہوتی ہیں کیونکہ معلومات کا اپ ڈیٹ چلتا رہتا ہے۔ گھر میں بیٹھے بیٹھے علم اور معلومات کے اس سمندر میں آپ غوطہ زن ہوسکتے ہیں۔ اگر آپ سفر میں بھی ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں، لیپ ٹاپ آپ کی مشکلیں آسان کردے گا۔ اگر آپ اس کے خرچ کے متحمل نہیں ہوسکتے تو کوئی بات نہیں اپنے ipod پر بھی ان e بکس کو کھول open سکتے ہیں۔ PDF کی شکل میں محفوظ e کتابیں آپ کی علمی پیاس بجھانے کے لیے موجود ہیں۔ آپ کو کسی لائبریری میں جانے کی ضرورت نہیں۔ اب تو ڈیجیٹل Digital لائبریری کا زمانہ آرہا ہے اور اردو کتابیں بھی اس پر موجود ہیں۔

بہت سے اخبار اور اردو رسائل انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں آپ اپنی مرضی کے مطابق ان کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔ دنیا کے کسی بھی ملک سے شائع ہونے والی عمدہ ترین کتابیں دستیاب ہیں ایسے ادبی شاہکاروں سے آپ گھر بیٹھے مستفیض ہوسکتے ہیں۔ یہی نہیں اب تو ویڈیو کانفرسنگ کے ذریعے ان فنکاروں سے آپ گفتگو بھی کرسکتے ہیں۔ اس طرح اپنے میدان کے نامور اشخاص سے چاہے وہ طب سے جڑے ہوں، قانون سے ادب اور شاعری سے یا مینجمنٹ سے، ان کے تجربات سے آپ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ انھیں کام کرتے ہوئے حرکت میں دیکھ سکتے ہیں۔ مثلاً ایسے ماہر امراض قلب جن سے فون پر گفتگو کرنا میڈیکل کے طلبہ کے لیے ناممکن ہے، انٹرنیٹ پر آپ انھیں کوئی پیچیدہ سرجری یا آپریشن کرتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔ ای لرننگ e-learning کے دوران آپ ان سے اپنے اشکال اور شکوک کا ازالہ بھی کرسکتے ہیں اور اپنے جوابات گھر بیٹھے حاصل کرسکتے ہیں۔ الکٹرانکس اور کمپیوٹر نے Virtual Dissection کی سہولت بھی فراہم کی ہے یعنی کسی جیتے جاگتے جانور کی تشریح (چیر پھاڑ) کے بجائے 3D کی شکل میں بنائے گئے سافٹ ویئر کے ذریعے

کوئی طالب علم مجازی چیر پھاڑ (Virtual Dissection) کرسکتا ہے۔ اسی طرح دنیا کے مختلف میدانوں اور مضامین کے ماہرین کی بلا معاوضہ خدمات گھر بیٹھے حاصل کی جاسکتی ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ انٹرنیٹ پر e بکس کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ کچھ سائٹ تو اپنی خدمات مفت میں مہیا کرواتے ہیں آپ ان کتابوں کو ڈاؤن لوڈ بھی کرسکتے ہیں۔ آج دنیا میں web sites کی اتنی تعداد ہوچکی ہے کہ ان کا شمار ممکن نہیں اور دنیا کا کوئی بھی موضوع ان سے نہیں چھوٹا۔ اردو میں بھی کئی ویب سائٹ ہیں جن پر اردو زبان و ادب، ثقافت تہذیب و تاریخ پر معلومات کا خزانہ موجود ہے چند سائٹ یہ ہیں

www.kitabghar.com اور http/www.qalamkar.com

اطلاعاتی ٹیکنالوجی کی بدولت اپنی تحریر کو براہ راست اردو رسم الخط میں کہیں بھی بھیجا جاسکتا ہے اب انھیں پہلے unicode لنگویج میں تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں۔

ان تحقیقات نے امتحان کے نظام میں بھی نمایاں تبدیلیاں کی ہیں۔ کئی کورسز میں داخلے کے فارم نیز بہت سے مسابقتی امتحانات کے فارم on-line بھرے جاتے ہیں بلکہ کچھ شعبے تو الکٹرانک کے علاوہ کسی اور شکل میں فارم منظور نہیں کرتے بلکہ کچھ امتحانات تو آن لائن ہوتے ہیں۔ ان کے نتائج منٹوں میں دے دیے جاتے ہیں اور اس طرح امیدوار اور ان کے والدین ذہنی کوفت اور انتظار کی زحمت سے بچ جاتے ہیں۔

انٹرنیٹ کی وجہ سے معلومات کی ترسیل اور منتقلی بہت آسان ہوگئی ہے۔ DVD, CD اور پین ڈرائیو کے ذریعے انھیں مطلوبہ مقامات تک بآسانی بھیجا جاسکتا ہے۔

ریاضیات اور حساب کتاب کی پیچیدگیوں اور دقتوں کو کمپیوٹر نے مکمل طور پر دور کردیا ہے اس کے لیے باقاعدہ سافٹ ویئر ہیں اور ان لائن میں مہارت حاصل کرنے کے لیے کئی خصوصی پروگرام اور سافٹ ویئر بازار میں موجود ہیں۔ عمارتوں کی تعمیر، فیشن ڈیزائننگ، مصوری، مشنریوں، میکانیت کی دنیا، صنعتوں وغیرہ میں کمپیوٹر اور کمپیوٹرائزڈ پروگرام بلاتکلف استعمال ہوتے ہیں۔ ماہرین کی پیشہ ورانہ صلاحیت میں اضافہ ہوا ہے۔ CAD (کمپیوٹرائزڈ ڈیزائن) کے ذریعے ہر ممکنہ نقشے، ڈیزائن کا تصور کرکے ان میں سے مناسب ترین کا انتخاب کیا جاسکتا ہے۔ یہی نہیں اب تو کہانیوں، ڈراموں، ناولوں وغیرہ کو تحریر کرنے میں کمپیوٹر کا سہارا لیا جاتا ہے اس میں نئے نئے تجربات بھی ہوتے رہتے ہیں چنانچہ جلد ہی ہندوستان کا پہلا Cell-novel منظر عام پر آرہا ہے جو کہ 90 sms پر مشتمل ہے۔ یہ اپنی نوعیت کی پہلی چیز ہوگی۔ کمپیوٹر اور روبوٹ تو اب اس حد تک ہماری زندگی میں دخیل ہوگئے ہیں کہ بعض ماہرین اس خدشے کا اظہار کرنے لگے ہیں کہ کہیں مستقبل میں ایسا نہ ہوجائے کہ خود کمپیوٹر اور روبوٹ انسانوں کو اپنی مرضی اور حکم کا تابع نہ بنالیں اور حکمرانی نہ کرنے لگیں!

مختصر یہ کہ الکٹرانکس بالخصوص کمپیوٹر، اطلاعاتی ٹیکنالوجی کی ترقی نے درس و تدریس، تعلیمی اداروں اور تعلیمی وسائل کے میدان میں نئے جہات کھولے ہیں۔ تعلیم آج کسی جماعت، مذہب، نسل یا ملک کی جاگیر نہ رہ کر عالمی استفادے کی ایک شے بن گئی ہے اور آنے والے دنوں میں ہم اس میں حیرت انگیز تبدیلیوں کا مشاہدہ کریں گے۔ حکومت ہند نے اس کے بڑھتے اثرات کو محسوس کرتے ہوئے ایک خاص مصنوعی سیارہ Edusat خلا میں چھوڑا ہے اور نئے بجٹ میں تعلیم خصوصاً اعلیٰ تعلیم سے متعلق جو تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ نیز لازمی بنیادی تعلیم کا جو قانون پاس کیا گیا ہے اس کی بدولت آنے والے چند دھوں میں بھارت کی تعلیمی تصویر بدل جائے گی اور مقابلے و مسابقت کے اس دور میں یقیناً یہ ملک ایک سوپر پاور کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر ابھرے گا۔ □□□

پتہ:
"Gulfishan" A/61, Civil Colony,
Kalamna Road, Kamptee,
(Dist. Nagpur)-441002

بچوں کی صلاحیتیں ان کی مادری زبان سے ابھرتی ہیں۔
گھروں میں بہتر اردو تعلیم کا انتظام کیجیے۔
اردو کی نئی نسل کو تیار کرنا ہم سب کا فرضِ اولیں ہے۔

عبدالعلیم قدوائی

ابو موسیٰ جابر بن حیان ماڈرن کیمسٹری کا بانی

دنیا کی تاریخ عجیب وغریب واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ آٹھویں صدی عیسوی میں یورپ علم وتحقیق سے نا آشنائے محض اپنے دور جہالت Darkages سے گزر رہا تھا۔ عین اسی زمانے میں مشرق وسطیٰ کی خلافتِ عباسیہ میں سماجی، طبیعاتی سبھی قسم کے علوم کی ترویج، تحقیق اور ترقی ہو رہی تھی اردو دنیا کو نت نئے انکشافات، ایجادات اور تحقیقات کی گراں قدر خدمات کے ذریعے حاصل ہو رہی تھی۔

ابوموسیٰ جابر بن حیان (721AD تا 815AD) جسے لاطینی زبان میں Geber کے نام سے جانا جاتا ہے ایران کے صوبہ خراسان میں واقع ایک تاریخی شہر طوس میں خلافت بنی امیہ کے آخری دور میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے علم کیمیا کی طرف خصوصی توجہ کی اور اپنے مشاہدات وتجربات کے ذریعے اسے بڑی ترقی دی چنانچہ اسکو ماڈرن کیمسٹری کے بانی اور محسن کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ بیک وقت ایک نامور کیمیا داں، منجم، ماہر طبیعات طبیب اور دواساز تھے۔ انھوں نے ایسے اہم طریقے اور مرحلے دریافت کیے جس کی وجہ سے کیمیائی تجربہ گاہوں میں زندگی اور حرکت کی برقی رو دوڑ گئی۔ انھوں نے مختلف مادوں Substances کے عربی میں نام تجویز کیے اور ان کی خصوصیات پر متعدد قسم کے آلات و ساز وساماں سے قیمتی اور مثبت تجربے اور مشاہدات کیے اور بہت سے نئے کیمیائی مرکبوں اور محلول بنانے کے طریقوں کا پتہ چلایا جن سے دنیا ناواقف تھی۔ مثلاً انھوں نے مختلف قسم کے نمکیات کو صاف اور مجلّا کر کے سلفورک ایسڈ اور ہائیڈروکلورک ایسڈ اور شورے کو ملا کر نائٹرک ایسڈ بنایا اور پھر ان دونوں کے مرکب ایکوار یجیا سے سونے کو پگھلانے میں کامیابی حاصل کی۔ وہ دنیا کے پہلے سائنس دان تھے جنھوں نے کیمسٹری کو ایک باقاعدہ طبعی علم کی حیثیت سے پیش کیا اور اس میں عملی تجربات اور مشاہدات کی اہمیت کا اعلان کیا۔ انھوں نے متعدد قسم کے ایسڈ (تیزاب) دریافت کیے جیسے نائٹرک ایسڈ (کھٹے اور رکچے پھلوں کے رس سے کشید کر کے) ایسیٹیک ایسڈ (سرکہ سے نکالا ہوا) اور تارتارک ایسڈ وغیرہ۔ انھوں نے سنکھیا، سرمہ اور اس طرح کے بہت سے مفید کیمیائی مرکب اور محلول ایجاد کیے جو آج کل عام طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ جابر نے گندھک اور پارے کی مختلف خصوصیات کو دریافت کیا اور ان کے مبادی اصول وضع کیے۔ اسی طرح روزمرہ میں استعمال آنے والی چیزوں کو بنانے اور ان کی کوالٹی کو بہتر بنانے کے طریقے تجربے کر کے نکالے مثلاً فولاد بنانا، سونے پر نقاشی چمڑے کی دباغت شیشہ سازی رنگ سازی وغیرہ۔ ان کی تحقیقات اور معلومات نے بعد کی اسلامی سائنس دانوں خصوصاً کیمیادانوں جیسے الکندی، الرازی، الطغری اور العراقی وغیرہ کی بڑی مدد نویں صدی اور تیرھویں صدی عیسوی کے درمیان میں کی۔ ان کی کتابوں اور علمی کاوشوں سے کئی سو سال کے بعد یورپ کے کیمیادانوں نے پارس پتھر کو ڈھونڈھنے اور پارے کو قابو میں لانے کی بڑی کوششیں کیں۔

جابر بن حیان کا دوسرا بڑا زبردست کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے کیمیاوی عناصر اور مادوں کو متعین نام دیے اور عربی اعداد وشمار میں ان کی گنتی کا کام کیا اسی کے ساتھ ہی مختلف دھاتوں (سونا چاندی، سیسہ تانبا لوہا وغیرہ)، اسپرٹ یعنی جو چیزیں گرم کرنے سے بھاپ بن کر اڑ جاتی ہیں مثلاً کافور، سنکھیا الومنیم کلورائڈ گندھک، پتھروں اور پوڈروں کی درجہ بند تقسیم کی۔ جس سے کیمسٹری کے علم کو دنیا میں بڑی ترقی ملی۔

جابر نے مختلف علوم کی تحصیل ان کے ماہرین سے کی، کوفہ میں ایک مذہبی رہنما جناب جعفر صادق سے ان کے خاص تعلقات ہو گئے اور انھوں نے اپنی دینداری اور رضاص کر بندگی کے احساس کی وجہ سے طبیعاتی علوم کا مطالعہ بڑی دلچسپی اور سچے شوق سے کیا۔ خلیفہ ہارون رشید کے دربار میں ان کو بڑی عزت ملی اور خاندان برامکہ کے وزرا نے ان کی بڑی علمی سرپرستی کی چنانچہ وہ آزادی سے تجربات ومشاہدات کرنے اور کتابوں کے لکھنے میں مصروف رہے۔ گو یہ بھی ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ خاندان برامکہ سے قربت انھیں خاصی مہنگی پڑی اور جیدارڈ ساکن کریمونا نے 1187 میں ان کی کتاب السبعین کا ترجمہ کیا بعد میں مارسلین برتھلٹ نے کتاب الملوک، کتاب المیزان اور پارے پر کتاب اور جابر کی بہت سے وضع کردہ اصطلاحات کا ترجمہ کر کے یورپ کی

سائنٹفک اور ٹیکنکل معلومات میں اضافہ کیا۔

جابر بن حیان کو خلیفہ ہارون الرشید کے دربار میں بحیثیت ایک ماہر کیمیادان کے عروج حاصل ہوا اور اس نے اسی زمانے میں اپنی مشہور کتاب ''کتاب الزہرہ'' اسی موضوع پر لکھی۔ وہ اس زمانے کے مشہور عالم جناب جعفر صادق کا بڑا معتقد تھا۔ اس کی گہری مذہبیت کا ثبوت اس کی تحریروں سے ملتا ہے جس میں اس نے خدا کی عظمت و بے مثال قوت خلاقیت کی بڑی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ بغیر خدا کی اطاعت و عبادت کے کوئی بھی کیمیاوی تجربہ ومطالعہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔ وہ مصری اور یونانی کیمیادانوں کی علم وتحقیق کا قائل تھا چنانچہ اس نے سقراط، فیثاغورث اور اہریس کی صلاحیتوں اور کارناموں کی داد دی ہے۔ اس نے فیثاغورث اور نیوپلوڈنک سسٹم میں بیان کیے گئے عناصر اور ان کی خصوصیات کا تجزیہ کیا اور ان پر عربی اعداد وشمار کے نمبر ڈالے۔ طبعی علوم کے مختلف موضوعات پر اس نے بے شمار کتابیں رسالے اور مضمون لکھے۔ یہاں تک بعض روایات میں یہ بیان کیا گیا کہ اس نے 112 کتابیں لکھی تھیں۔ مگر ایک تو اس نے اپنی تحریروں میں مخصوص اعلام، مخفی اشارے اور کنائے بکثرت استعمال کیے جس کی وجہ سے وہ عام فہم نہ ہوسکیں اور پھر وہ تھوڑے ہی عرصے میں ناپید ہوگئیں۔ اس وقت اس کی حسب ذیل کتابیں مشہور و معروف ہیں اور ان کے لاطینی کے علاوہ کئی یوروپی زبانوں میں ترجمے ہوچکے ہیں۔ موجودہ کیمسٹری کے بنیادی قوانین و ضوابط میں جابر کی چھاپ صاف اور واضح طور پر نظر آتی ہیں۔

1. کتاب الزہرہ

اس میں اس نے مختلف کیمیاوی مادوں اور ستاروں کے بارے میں مفصل اور محققانہ معلومات فراہم کی ہیں

2. کتاب الاحجار

اس میں مختلف قسم کے پتھروں، ان کی خصوصیات اور اثرات کا بیان کیا گیا ہے۔

3. کتاب المیزان

جس میں ان کا مشہور نظریہ قدرت میں توازن پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

4. کتاب السابعین

کریمونا کے جیراڈ نے جس کا ترجمہ 1187 عیسوی سے قبل کیا۔

عہد وسطی میں اس کی کتابوں اور مضامین کے ترجمے لاطینی اور دوسری زبانوں میں کیے گئے۔ حال میں آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، نیویارک اور پیرس میں اہتمام سے جابر کی کتابیں شائع کی گئی ہیں اور اس عظیم سائنس داں کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔

ایک دلچسپ بات اور ہے کہ چاند میں نظر آنے والے آتش فشاں پہاڑ کے دہانے کو جبر کارٹر Geber Carter کا نام دیا گیا ہے۔

□□□

پتہ:
Nation and the World,
New Delhi

وضاحتی کتابیات

مرتب: مظفر حنفی

پروفیسر مظفر حنفی نے قومی اردو کونسل کے ایک منصوبے کے تحت سال بہ سال شائع ہونے والی کتابوں کے تعارف اور مختصر تبصرے پر مبنی ''وضاحتی کتابیات'' کل 22 جلدوں میں مرتب کی ہے۔ ہر برس کی کتابوں کا ذکر الگ الگ جلدوں میں ہے۔ موصوف نے وضاحتی کتابیات کے متعینہ اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے کم سے کم الفاظ میں متعلقہ کتاب کے بارے میں معروضیت کے ساتھ ضروری اطلاعات فراہم کردی ہیں، جن کے وسیلے سے محقق اور طالب علم مطلوبہ معلومات حاصل کرسکتے ہیں۔

22 جلدوں کی مجموعی

قیمت:-/2693 روپے

اے۔کے۔سی۔ اوٹاوے (ہماری مطبوعات سے)

مدرسہ ایک سماجی اکائی کی حیثیت سے

اسکول اپنے اِردگرد کے وسیع تر سماج کے اندر ایک سماجی گروہ کی حیثیت سے اپنی منظّم زندگی کو جاری رکھتا ہے۔(1) بعض اوقات اسکول کو ایک ''سماج'' کا نام دیا جاتا ہے۔ لیکن سماجیاتی نقطۂ نظر سے یہ گمراہ کُن بات ہے۔ اس کو کمیونٹی کہنا زیادہ مناسب ہوگا، کیونکہ اُس کے افراد بہت سی باتوں میں اشتراک رکھنے کے باوجود وہ تمام فریضے ادا نہیں کرتے جو ایک سماج کے فریضے ہوتے ہیں۔ اسکول ان معنوں میں ایک کمیونٹی ہے جن معنوں کی تشریح ہم پہلے باب میں کر چکے ہیں اور وہ اس لیے کہ اسکول کے اراکین کی اکثریت ان بچوں پر مشتمل ہوتی ہے جو سماج کی مکمل رُکنیت کے قابل نہیں ہوتے اور اُن کا اسکول میں ہونا کسی حد تک سماجیانے (Socialization) کے مقصد کو پورا کرنے کے لیے ہوتا ہے۔

اسپنس رپورٹ (Spens Report) میں اسکول کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے: ''ایک سماجی اکائی یا ایک خصوصی نوعیت کا سماج۔'' رپورٹ کا پورا ٹکڑا اس طرح ہے: ''موجودہ زمانے کے اسکول کو محض ''حصولِ علم کا ایک مرکز'' خیال کرنے کی بجائے ایک ایسی سماجی اکائی یا ایک ایسا خصوصی نوعیت کا سماج خیال کرنا چاہیے جس میں بڑے اور چھوٹے، اُستاد اور شاگرد، ایک مشترک زندگی بسر کرتے ہیں، اور یہ ایک ایسے دستور العمل کے تحت ہوتا ہے جس کو اپنے اپنے طور پر سب تسلیم کرتے ہیں۔(2)...... مطلب اس اقتباس کا یہ نکلتا ہے کہ خود اسکول کا اپنا ایک سماجی ڈھانچہ ہونا چاہیے اور وہ جمہوری عمل کا پابند ہو، جیسا کہ اقتباس کے الفاظ میں مضمر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رپورٹ کے متعدد حصوں کا موضوع ہی وہ طریق ہائے کار ہیں جن کی مدد سے ایک آزاد کمیونٹی میں لڑکوں اور لڑکیوں کی تربیت کے لیے اس تعلیم سے کام لیا جا سکے جو بچوں میں بالکل ابتدائی عمر سے پہل کرنے کی صلاحیت (Initiative) اور ذمے دارانہ روش کی ہمت افزائی کرتی ہے۔ رپورٹ کے اس حصے کا عنوان ہے: ''اسکول ایک سماج کی حیثیت سے۔''(3) اور اس میں چند قطعی انداز کی تجاویز پیش کی گئی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے:

(1) یہ کہ طلبہ اسکول کے اصول و قواعد کی تشکیل میں خود بھی کچھ نہ کچھ حصہ ضرور لیں۔

(2) یہ کہ طلبہ کی زیادہ بڑی تعداد، نہ کہ صرف پریفکٹس (Prefects) ذمے داریوں کا بوجھ اُٹھائیں۔

(3) [1] یہ کہ عملۂ معلمین کا اپنے ہاتھوں میں ضرورت سے زیادہ اقتدار رکھنا، بالخصوص کلاس روم سے باہر سوسائٹیوں اور کلبوں کے باب میں، ہرگز مناسب نہیں۔ [ب] یہ کہ چھوٹے چھوٹے تنظیمی کاموں کو طلبہ پر چھوڑ دینا چاہیے، خواہ اُستادوں کے لیے وہ کام نسبتاً آسان ہی کیوں نہ ہوں — بلکہ یہ بھی ہونا چاہیے کہ طلبہ کو اپنی غلطیوں ہی کے ذریعے سیکھنے کے مواقع فراہم کیے جائیں۔

(4) یہ کہ اسکول اور اسکول سے باہر کے بالغ سماج کے مابین زیادہ گہرے روابط ہونے چاہئیں۔

ایک نسبتاً جدید سرکاری تالیف میں بھی اس معاملے سے بحث کی گئی ہے۔ وہ ایک پمفلٹ ہے جس کا عنوان ہے: ''نموپذیر شہری'' (Citizens Growing up)۔ اس پمفلٹ میں ''اسکول ایک کمیونٹی کی حیثیت سے'' کے عنوان سے ایک باب ہے، جس میں یہ سوال اُٹھایا گیا ہے کہ اسکول کو کس حد تک جمہوری بنیادوں پر استوار کیا جا سکتا ہے؟(4) اگر اسکول کے لیے یہ ضروری ہے کہ عملی شہریت سے اس کا کوئی تعلق ہو تو ظاہر ہے کہ اس کو ایک ایسے سماج کے لیے جس میں بالآخر طلبہ کو اپنی زندگی بسر کرنی اور اپنی کارکردگی دکھانی ہے فعال اراکین پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

ایک نقطۂ نظر وہ بھی ہے جو اس بات پر بہت زور دیتا ہے کہ اسکول کی کمیونٹی میں بیرونی سماج کے اعادہ و نقل کو بہت زیادہ دور تک لے جانا

'تعلیم، سماج اور کلچر'' سے ماخوذ، مصنف: اے.کے.سی. اوٹاوے، صفحات۔338، قیمت : -/61

نوٹ : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔

ہرگز مناسب نہ ہوگا، جو اس نقطۂ نظر کے حامی ہیں ان کا کہنا ہے کہ بچے ناپختہ اور دوسروں کے دست نگر ہوتے ہیں اور یہ ناممکن بھی ہے اور نامناسب بھی کہ وہ اپنی زندگی کے قواعد وضوابط کو خود مرتب کرنے کی کوشش کریں۔ ان کی اپنی ایک سماجی زندگی ہوتی ہے اور اس زندگی کا صحت مند ہونا ہی مستقبل کے لیے ایک کافی اور اطمینان بخش تیاری ہے۔ اس کے جواب میں یہ تو تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ سیاسی جمہوریت کے طرز پر کوئی مکمل قسم کی خود اختیاری حکومت فی الواقع ایک ناقابلِ قیاس تصور ہے، کیونکہ اس کے معنی تو یہ ہوں گے کہ طلبہ اپنے اساتذہ کا انتخاب بھی خود ہی کریں۔ دراصل جس چیز کی ضرورت ہے وہ ایک تدریجی عمل کی کارفرمائی ہے۔ یعنی بچوں میں بالغ سماج کے طور طریقوں سے واقفیت پیدا کرنے کے لیے ان کو بتدریج زیادہ سے زیادہ تر آزادی کی طرف لے جانا ہوگا، تاکہ بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ وہ بتدریج بڑھتی ہوئی آزادی اور ذمے داری کا تجربہ حاصل کریں۔ چنانچہ جان ڈیوی (John Dewey) نے کہا ہے:

''سماجی زندگی کے لیے تیار ہونے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ سماجی زندگی میں شرکت کی جائے۔'' کوئی شخص اچانک اور یک لخت ایک آزاد بالغ نہیں بن سکتا۔ اگر یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ بچے ماورائے سماج (Non-Social) کمیونٹی کا ایک جزو ہیں تو محض اس ایک امر کی بنا پر ان کو شروع سے آخر تک جابرانہ اقتدار کا نشانہ نہیں بنایا جاسکتا۔ اگر ہم بچوں کو اس بات کی تربیت دینا چاہتے ہیں کہ وہ دوسروں کے ساتھ مہربانی اور احترام کے ساتھ پیش آئیں تو طاقت کا مسلسل استعمال اس کا بہترین طریقہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔

اسکولی زندگی میں جمہوریت:

سوال یہ ہے کہ اسکول میں ہمیں عملی طور پر کیا کرنا ہے؟ جمہوری تصرف کا لبِّ لباب تو یہ ہے کہ مشاورت اور انتقال اختیارات کے طریقوں سے کام لیتے ہوئے اقتدار اور اثر کو مشترکہ بنایا جائے۔ چنانچہ ہمیں اپنے کام کا آغاز یہاں سے کرنا چاہیے کہ ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ اسکول کی سماجی تنظیم میں ان طریقوں سے کس طرح کام لیا جاسکتا ہے۔ تصرف کے کچھ ایسے دائرہ ہائے کار کی نشان دہی ناممکن نہیں جو مختلف درجوں میں اساتذہ اور طلبہ کے درمیان اشتراک کا ذریعہ ثابت ہوسکتے ہیں۔

(1) اساتذہ کا تصرف (Staff Control)

یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ عام تعلیمی پالیسی کا تعین عملۂ مدرسین کا کام ہے اور اسکول کے اربابِ اختیار یا مقامی اربابِ مجاز کے نمائندے کی حیثیت سے ہیڈ ماسٹر ہیڈ مسٹریس کی رائے آخری اور قطعی خیال کی جائے گی۔ بعض قواعد کی تشکیل کلیتاً عملہ مدرسین کے ہاتھوں میں ہوگی اور یہاں طلبہ سے مشورہ کرنا ضروری نہیں ہوگا۔ سزا کے بیشتر معاملات استادوں کے ہاتھ میں ہوں گے۔ نصاب اور طریقۂ تدریس پر بالعموم اساتذہ کو تصرفِ کلی حاصل ہوتا ہے، لیکن اس باب میں طلبہ کے ساتھ کچھ مشورہ یا مذاکرہ ناممکن نہیں۔

(2) طلبہ کے ساتھ مشورہ:

جہاں متبادل نصابات کا سلسلہ ہو وہاں طلبہ کے ساتھ مشمولاتِ نصاب کے بارے میں مشورہ کیا جاسکتا ہے اور ان کے میلانات کو زیرِ غور لایا جاسکتا ہے۔ اس چیز کا امکان اُس وقت زیادہ ہوتا ہے جب اسکول کے کام میں ڈالٹن پلان (Dalton Plan) کی کوئی شکل یا کوئی دوسرا انفرادی تفویضات والا طریقۂ تعلیم استعمال کیا جائے، یا پروجیکٹ میتھڈ (Project Method) کی مختلف صورتوں کو رائج کیا جائے۔ اسکول کی تنظیم اور قواعد وقوانین کا جہاں تک تعلق ہے کچھ ایسے نظام موجود ہیں جن کی رُو سے طلبہ کی مشاورتی جماعت کو یہ موقع حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنی تجاویز ہیڈ ماسٹر یا عملۂ مدرسین کو پیش کرے۔ یا پھر ہیڈ ماسٹر جن تبدیلیوں کو عمل میں لانا چاہتا ہے ان پر عمل آوری سے پہلے طلبہ کی کسی نمائندہ گروہ سے بات چیت کی جاسکتی ہے۔ وہ اسکول کونسلیں جو خالص مشاورتی نوعیت کی ہوتی ہیں اور جنھیں کوئی عملی اختیارات حاصل نہیں ہوتے اسی ذیل میں آتی ہیں۔

(3) وہ تمام کمیٹیاں جن میں طلبہ اور اساتذہ ایک جگہ جمع ہوتے ہیں اور ایک مخصوص آئین کے تحت کسی خاص مقصد کے پیشِ نظر مساویانہ طور پر ملتے ہیں اس نام سے پکاری جاتی ہیں۔ ہاؤس میٹنگس (House Meetings) اور کلاس میٹنگس (Form Meetings) وغیرہ، خصوصاً جب ان کی کارروائی عہدے داروں کے چناؤ اور ان کے اپنے اندرونی معاملات سے متعلق ہوتی ہے، اس کی عام مثالیں ہیں۔ یہی ان اسکول کونسلوں کی بہترین صورت ہے جن میں اساتذہ اور طلبہ دونوں کی نمائندگی ہوتی ہے۔ اسکول میگزین اور لائبریری وغیرہ کے لیے یا تفریحات کی خاطر کچھ خصوصی کمیٹیاں بھی ہوسکتی ہیں اور یہاں اساتذہ اور طلبہ مساویانہ سطح پر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرسکتے ہیں۔ اس نوع کی کونسلوں یا کمیٹیوں کی روحِ رواں یہ امر ہوگا کہ کچھ متعین حدود کے

اندر فیصلے جاری و نافذ کیے جائیں اور اُن فیصلوں کی تکذیب صرف ہیڈ ماسٹر کے خاص ویٹو ہی سے ممکن ہو، اور حقیقت میں اُس ویٹو کی کبھی نوبت ہی نہ آئے۔

(4) طلبہ کا تصرف (Pupil Control)

اس کو قطعی اور مکمل تصرف کے معنوں میں نہیں لینا چاہیے، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ طلبہ کے فیصلے نمایاں طور پر بااثر ہوں اور اکثر و بیشتر اُن کو چیلنج نہ کیا جاسکے۔ پریفکٹ سسٹم طلبہ کے تصرف ہی کی ایک مثال ہے جو فی الحقیقت منتقل شدہ اختیارات کی ایک خاص شکل ہے۔ پریفکٹوں کو بالعموم سزا دینے کے کچھ اختیارات حاصل ہوں گے اور اختیار و تصرف کے ایک خاص دائرے میں ان کو اپنے فیصلے نافذ کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ اسکول کے کھیلوں کی تنظیم اور اسکول سے باہر کی سوسائٹیوں اور کلبوں کے انتظام و انصرام کو تقریباً پورے طور پر طلبہ ہی پر چھوڑا جاسکتا ہے، اگرچہ عام طور پر ایسا کیا نہیں جاتا۔ اُستادوں کو بلاشبہ ان سرگرمیوں میں شرکت کا موقع دیا جاسکتا ہے، لیکن ان کے اقتدار کو یہاں کوئی دخل نہ ہوگا۔ پھر جہاں تک اسکول کے کام کا تعلق ہے، اس میں کچھ ایسے پروجیکٹ اور اختیاری حاضری کے گھنٹے (Periods) ضرور ہوتے ہیں۔ جہاں اساتذہ کی کم سے کم مداخلت کے ساتھ طلبہ کو پہل کرنے کا موقع دیا جاسکتا ہے۔ اس کا اطلاق اُن تفریحی مشاغل (Hobbies) پر بھی ہوگا جو بعض اوقات اسکول کے گھنٹوں ہی میں زیرِ عمل آتے ہیں۔

حالیہ برسوں میں اُس چیز کے جسے بعض اسکول کی ''حکومتِ خود اختیاری'' کہا جاتا ہے نہایت دل چسپ تجربات مختلف قسم کی اسکول کونسلوں کے ذریعے سرانجام پائے ہیں۔ اس سلسلے میں کچھ معلومات چھٹی جماعت کے شہری (Sixth Form Citizens) میں ملتی ہے جو 1949 میں Association for education in citizen ship کے لیے چھاپی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نوع کے تجربات اب خاصے عام ہوتے جارہے ہیں۔ ذیل کا اقتباس اس مقصد سے پیش کیا جاتا ہے کہ ایک مخلوط گرامر اسکول کے ایک مخصوص آئین کی مثال پیش کی جاسکے:

''جمہوریت کی تعلیم سارے اسکول کا کام ہے اور صرف چھٹی جماعت سے مختص نہیں ہے۔ مختلف عہدوں کے لیے طلبہ کو خود ان کے ہم جماعت چنتے ہیں۔ ہر جماعت میں ایک جماعتی کمیٹی ہوتی ہے جس کی صدارت جماعت کے ٹیچر کے سپرد ہوتی ہے۔ وسیع تر حلقۂ اثر سے تعلق رکھنے والی تجاویز اسکول پارلیمنٹ کو بھیجی جاتی ہیں جس کا اجلاس ایک میقات میں دو مرتبہ ہوتا ہے۔ یہ پارلیمنٹ تمام پریفکٹوں اور نائب پریفکٹوں اور ہر جماعت سے ایک لڑکے اور ایک لڑکی کی شکل میں دو دو نمائندوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اسکول پارلیمنٹ کے فیصلے آگے چل کر عملۂ مدرسین کی میٹنگ میں زیرِ غور آتے ہیں، اور اگر منظور کرلیے جاتے ہیں تو ان پر عمل ہوتا ہے، ورنہ دوسری صورت میں نامنظوری کی وجوہ سے اسکول کپتانوں کو مطلع کیا جاتا ہے جن کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ ان وجوہ کو سارے اسکول کی اسمبلی تک پہنچا دیں۔ پریفکٹوں کا چناؤ پوشیدہ ووٹنگ کے ذریعے چھٹی جماعت سے کیا جاتا ہے۔ سب طلبہ کو ووٹ کا حق حاصل ہوتا ہے پہلی اور دوسری جماعتوں کے طلبہ کے پاس پانچ ووٹ ہوتے ہیں، تیسری اور چوتھی جماعتوں کے طلبہ کے قبضے میں دس اور بقیہ اونچی جماعتوں میں سے ہر ایک کی دسترس میں بیس ووٹ ہوتے ہیں، عملۂ مدرسین کو یہ حق حاصل رہتا ہے کہ اگر کوئی چناؤ ہوا امیدوار نامناسب معلوم ہو تو اس کو خارج کردیا جائے۔'' (صفحہ 73)

یہاں جو صورت بیان ہوئی اس کی رُو سے اسکول پارلیمنٹ میں اساتذہ کو کوئی نمائندگی حاصل نہیں ہے۔ اور عملۂ مدرسین کی حیثیت گویا ایک ایوانِ بالا کی ہے جو پارلیمنٹ کی پیش کردہ تجویزوں کو رد کرسکتا ہے۔ پریفکٹوں کے چناؤ کا طریقہ یقیناً ایسا ہے کہ اس کی نقل کی جاسکتی ہے۔ یہ بظاہر ایک سیدھا سادھا جمہوری طریقِ عمل ہے اور مناسب کنٹرول کے تحت غلطیوں کا امکان بہت کم رہ جاتا ہے۔ بہترین کنٹرول یہی ہے کہ حلقۂ انتخاب کو چند جماعتوں تک محدود کردیا جائے۔ یا جیسا کہ اوپر کی مثال سے ظاہر ہے، بڑی عمر کے طلبہ کو رائے دہی کا زیادہ حق دیا جائے۔ بیرونی سماج کی روش کے مطابق یہ مناسب ہوگا کہ طالب علم ایک خاص جماعت میں پہنچنے پر ہی پریفکٹوں کے چناؤ میں رائے دہی کا حق حاصل کرے اور ضمنی سماجی ذمے داری کا حق دار خیال کیا جائے۔ ویسے اس وقت بیشتر اسکولوں میں پریفکٹوں کا تقرر اسٹاف یا تنہا ہیڈ ماسٹر کی ذمے داری خیال کی جاتی ہے۔

ضروری ہے کہ پریفکٹ سسٹم کو اور پریفکٹوں اور نائب پریفکٹوں کی میٹنگوں کو اسکول کونسلوں سے گڈمڈ نہ کیا جائے۔ پریفکٹوں کی

کارگزاری جمہوریت کی مشینری کا کوئی لازمی جزو ہرگز نہیں ہے، اصل حقیقت تو یہ ہے کہ پریفلکٹ کی پوزیشن بار بار بدنامی کا شکار ہوئی ہے اور بعض اسکولوں میں شدید قسم کی نظرثانی کی محتاج ہے۔ پریفلکٹوں کا عمل بسااوقات چھوٹی موٹی پولیس یا سارجنٹ میجروں کا سا عمل ہوتا ہے۔ جس سے وہ عملۂ مدرسین کے بوجھ کو ہلکا کرنے کی خدمت انجام دیتے ہیں، یا پھر اس سے بھی بدتر صورت یہ ہوتی ہے کہ پہرہ داروں کی طرح راہ داریوں میں ٹریفک کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ اور یہ بھی نہیں کہ اس کے بدلے میں کوئی وقار ان کے حصے میں آتا ہو یا کوئی ذمے دارانہ حیثیت ان کو دی جاتی ہو۔ پھر بعض اوقات پریفلکٹوں کا کام صرف اس قدر رہتا ہے کہ وہ بالائی اقتدار اور متمکن قانون سے منسلک رہ کر اپنی ایک محدود قسم کی اشرافیہ قائم کرلیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس پورے نظام کو ازسرِ نو ترتیب دیا جائے تاکہ وہ ایک بہتر جمہوری ماحول کی نمائندگی کر سکے۔

اب ہم پھر اسکول کونسل کے مسئلے کی طرف آتے ہیں۔ نجی ترقی پذیر (Progressive) اسکولوں میں کیے جانے والے تجربات ماڈرن اسکول ہینڈبک، 1936 میں بیان کیے گئے ہیں۔ جے. ایچ سمپسن (J.H. Simpson) نے Sane Schooling میں جو مثال دی ہے وہ بھی قابلِ غور ہے۔ اس میں سارے اسکول کا ایک جلسۂ عام بار بار بلایا گیا، اور اسکول کے تمام امور کی دیکھ بھال کے لیے عہدے داروں اور بہت سی کمیٹیوں کا چناؤ عمل میں آیا۔ اس تجربے کا ایک مخصوص وصف یہ تھا کہ حکومت کے مالی پہلوؤں پر نمایاں توجہ صرف کی گئی۔ اسکول کا ایک بنک تھا، ایک دوکان تھی، اور کھیل اور تفریحات کی کمیٹیوں کو بڑی بڑی رقموں پر اختیار حاصل تھا۔ چنانچہ آمد و خرچ کے میزانیے مرتب کیے گئے اور ذمے دار طالبِ علم حکام نے ان کو اسکول میٹنگ کے سامنے رکھا۔ بحث مباحثے کے بعد یہ طے پایا کہ اخراجات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اسکول کے تمام افراد پر ایک ٹیکس لگایا جائے۔ روپیہ خرچ کرنے کے معاملے میں سماجی ذمے داری کے جس احساس کی ضرورت ہے اور اس کا ایک سرسری ابتدائی تجربہ جو افادیت اپنے اندر رکھتا ہے اس کے پیشِ نظر مذکورہ طریق کار کو آگے بڑھانے اور ترقی دینے کی کوشش ایک قابلِ قدر کام ہوگا۔

اسکول کونسل کی بہت سی مختلف اقسام ممکن ہیں۔ اس لیے ہم ان خصوصیات کو جو بیشتر اقسام میں مشترک ہیں اور ان فائدوں کو جو ان سے وابستہ خیال کیے جاتے ہیں مجملاً پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔

□□□

اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک

مصنف: خلیل الرحمٰن اعظمی

اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک خلیل الرحمٰن اعظمی کی تحقیقی اور تنقیدی کتاب ہے۔ اس کتاب میں تعارف اور مقدمے کے علاوہ تین ابواب ہیں، جو ترقی پسند مصنفین کی تحریک، ترقی پسند ادبی سرمائے کا جائزہ اور ترقی پسند تنقید ایک تجزیاتی مطالعہ پر مشتمل ہیں۔ رشید احمد صدیقی نے جو اس مقالے کے نگراں تھے، خلیل الرحمٰن اعظمی کی تلاش و تحقیق کے طریقۂ کار، قابلِ قدر مواد کی فراہمی اور اس کی ترتیب اور تجزیے کی تعریف و توصیف کی ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ کئی معنوں میں فکر انگیز ہے۔

صفحات: 410، قیمت: 241/- روپے

آزادی کے بعد اردو طنز و مزاح

مرتب: ابوالکلام قاسمی

پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے آزادی سے تقریباً ربع صدی قبل سے نصف صدی بعد تک کے معتبر طنزیہ و مزاحیہ مضمون نگاروں کو اس کتاب میں یکجا کیا ہے، جن میں انجم مانپوری، ملّا رموزی، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، شوکت تھانوی، کنھیا لال کپور، فکر تونسوی، حسنین عظیم آبادی، ابراہیم جلیس، یوسف ناظم، احمد جمال پاشا، مجتبیٰ حسین، شفیقہ فرحت اور اعجاز علی ارشد جیسے 25 قلم کاروں کی تخلیقات شامل ہیں۔ اس انتخاب سے آزادی کے بعد لکھے جانے والے مزاحیہ ادبی سرمایے کی ارتقائی منازل کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ متن اردو اور ہندی دونوں رسم الخطوں میں ہے۔

صفحات: 655، قیمت: 457/- روپے

سیّد عابد حسین

(ہماری مطبوعات سے)

نئی قومی تہذیب کی تعمیر

ہم نے دیکھا کہ اس پراچین دیس میں جو ہندوستان کہلاتا ہے کچھ ایسا جادو ہے کہ یہاں آکر کثرت وحدت کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ دنیا کے مختلف حصوں سے مختلف قومیں اپنی الگ الگ تہذیبیں لے کر آتی گئیں اور اس دیس میں بستی گئیں اور رفتہ رفتہ ہندوستان کی آب وہوا کے غیر محسوس اثر نے یہ کرتب دکھایا کہ ہر چند ان تہذیبوں کی ذہنی اور مادّی صورتوں میں ایک حد تک اختلاف باقی رہا لیکن ان کا روحانی ہیولےٰ ایک ہوگیا۔ چنانچہ ہندوستان کا تہذیبی نقشہ ہمیشہ ایک رنگ کی زمین پر طرح طرح کے سطحی رنگوں کے تال میل کی بہار دکھاتا۔

ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں باری باری سے اتحاد اور انتشار کے دور گزرتے رہے اور تہذیبی زندگی میں بھی ان کا عکس کم و بیش نظر آتا رہا۔ ہر اس دور میں جب کہ ملک بہت سی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا اور وہ آپس میں لڑتی رہتی تھیں۔ تہذیبی زندگی میں بھی افراتفری پائی جاتی تھی اور جب کسی بڑی سلطنت کے قائم ہونے سے سیاسی وحدت پیدا ہوجاتی تھی تو ایک نئی قومی تہذیب کی تاسیس سے تہذیبی وحدت بھی بحال ہوجایا کرتی تھی۔ صرف سلطنت دہلی اور برطانوی سلطنت ان وجوہ سے جن کا ذکر آچکا ہے اس تہذیبی امتزاج کے عمل میں ناکام رہیں۔

آج جب کہ ہندوستان کے اندر اتنی گہری سیاسی وحدت ہے جتنی اس کی تاریخ میں کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی اس کا امکان پیدا ہوگیا ہے کہ ایک نئی قومی تہذیب کی عمارت بہت وسیع اور پائیدار بنیادوں پر کھڑی ہوسکے۔ اس نئی قومی تہذیب کی تعمیر نہ صرف ممکن بلکہ اشد ضروری ہے اس لیے کہ ہماری قومی آزادی اور سیاسی وحدت بغیر اس تہذیبی وحدت کے ڈانواڈول رہے گی۔

اگر موجودہ تہذیبی حالات کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں یہ نظر آئے گا کہ ہندوستان کی مختلف جماعتوں کی تہذیبی روح یعنی ان کا مذہبی، اخلاقی معاشرتی اور جمالی شعور دراصل ایک ہے اور ان کے رہن سہن میں بھی مجموعی طور پر یکسانی پائی جاتی ہے۔ غرض قومی تہذیب کی ایک گہری اور ٹھوس بنیاد پہلے ہی سے موجود ہے، مگر زبانیں ملک کے مختلف حصوں میں الگ الگ ہیں اور ہر لسانی علاقے میں مقامی رنگ سے عام تہذیبی نقشے میں تبدیلیاں پیدا کردیتی ہیں اس لیے اس بنیاد پر مشترک تہذیب کی تعمیر مشکل ہوگئی ہے اور لسانی فرقہ واریت نے اس مشکل کو اور بڑھادیا ہے۔

چنانچہ تہذیبی ہم آہنگی کی فضا پیدا کرنے کے لیے ایک طرف تو اس کی ضرورت ہے کہ لسانی فرقہ واریت کو ختم کردیا جائے اور سب ہندوستانی زبانوں کو اور ان کے بولنے والوں کی مختلف تہذیبوں کو اپنے اپنے قطعے میں آزادی سے نشوونما پانے کا موقع دیا جائے اور دوسری طرف اس بڑے دائرے کے گرد جو ملک کی مجموعی تہذیبی زندگی کو محیط ہے ایک دائرہ مقامی تہذیبوں کے قطعوں کو کاٹتا ہوا کھینچا جائے جسے مشترک قومی زبان اور تہذیب کا دائرہ قرار دیا جائے اور پھر قومی زبان اور تہذیب کو ملک کے ہر ایک باشندے تک پہنچانے کے لیے مؤثر تدابیر اختیار کی جائیں۔

یہ تدابیر تین طرح کی ہونی چاہئیں۔

(1) ایک معقول لسانی پالیسی اختیار کرنا تاکہ قومی زبان ہندی کی جو مخالفت اس خوف کی بنا پر کی جارہی ہے کہ وہ علاقائی زبانوں کو ہٹا کر ان کی جگہ لے لے گی وہ دور ہوجائے، ہندی کو زیادہ سے زیادہ مقبولیت حاصل ہو اور وہ کم سے کم وقت میں سارے ملک میں پھیل جائے۔

(2) مختلف لسانی جماعتوں کے منتخب مفکروں، مصنفوں اور فنکاروں کو ایک جگہ جمع کرنا تاکہ ان کے میل جول اور لین دین سے ادب اور

"قومی تہذیب کا مسئلہ" سے ماخوذ، مصنف: سیّد عابد حسین، صفحات۔220، قیمت : -/54

نوٹ : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔

فنون لطیفہ کے قومی طرز و اسلوب جو قومی تہذیب کی تشکیل میں اہم عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں وجود میں آئیں۔

(3) اس مشترک تہذیب کو جو اس طرح بنے گی ہندوستان کے ہر خطے اور ہر جماعت پہنچانا تا کہ سارے ملک میں قومی وحدت کی روح پیدا ہو۔

مشترک زبان کی حیثیت کسی زبان کی تہذیب میں صرف اتنی ہی نہیں کہ وہ اس کے افراد کے درمیان مبادلۂ خیالات کا اور اشتراک عمل کا ذریعہ ہے بلکہ وہ اس تہذیبی روایات کے نشر اور نقل کے وسیلے کے طور پر بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ ایک طلسمی شراب ہے جس کے اندر جماعت کے مشترک احساسات، جذبات، مزاج، روایات و دستور کی روح کھنچ کر آگئی ہے اور جس کو پی کر جماعت کے افراد ایک ہی کیف میں ڈوب جاتے ہیں۔ دنیا کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ کسی ملک میں صحیح معنی میں قومی تہذیب اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب سارے ملک کی زبان ایک ہوگئی ہو یا کم سے کم مقامی زبانوں کے ساتھ ساتھ ایک مشترک زبان بھی پیدا ہو چکی ہو۔ اگر یہ مشترک زبان صرف ایک حلقے یا طبقے تک محدود رہے تو قومی وحدت کا سچا اور گہرا احساس بھی اسی طبقے تک محدود رہتا ہے جسے مشترک زبان پر عبور حاصل ہے۔ ہندوستان میں قومی وحدت کے جتنے دور اب تک گزر چکے ہیں یعنی ویدک ہندو تہذیب، بودھ تہذیب، پورانک ہندو تہذیب اور عہد وسطیٰ کی ہندوستانی تہذیب کے دور، ان سب میں مشترک تہذیبی زبان خواہ وہ سنسکرت ہو یا پالی یا فارسی اونچے طبقوں سے آگے نہیں بڑھی اس لیے یہ سب تہذیبیں اور قومی وحدت کے احساسات جو ان پر مبنی تھے ہندوستانیوں میں عام نہیں ہونے پائے بلکہ خاص خاص طبقوں تک محدود رہے۔ جہاں تک عوام کا تعلق ہے ان کا حصہ ملک کے مشترک تہذیبی سرمائے میں محض برائے نام تھا۔ یوں تو تینوں قدیم تہذیبوں نے بھی زندگی میں جو وسعت اور وحدت پیدا کی تھی وہ بڑی حد تک اونچے طبقوں کے لیے تھی، عوام کی زندگی مقامی تہذیبوں کے تنگ دائرے میں گزرتی تھی، ایک خطے اور دوسرے خطے کے لوگوں میں چند مذہبی عقائد اور اعمال کے سوا کوئی چیز مشترک نہ تھی۔ لیکن عہد وسطیٰ کی ہندوستانی تہذیب جسے مغلوں نے تعمیر کیا تھا بالکل واضح طور پر اونچے طبقوں کی تہذیب تھی اور اسے عوام سے تعلق نہ تھا اس لیے کہ اس کی بنیاد مذہبی وحدت پر نہیں بلکہ سیاسی وحدت پر تھی جس کی نوعیت اور قدر و قیمت کو عوام مشکل سے سمجھتے تھے۔

مغلیہ عہد کے آخری اور برطانوی عہد کے ابتدائی دور میں جہاں نئے حالات اور نئی قوتوں کی بدولت عہد وسطیٰ کی ہندوستانی تہذیب مٹنے لگی اور قومی وحدت کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ وہاں ایک ایسا عمل شروع ہوا جو ہماری تہذیبی زندگی کی آئندہ نشوونما کے لیے زبردست اہمیت رکھتا ہے اور جس نے یہ امکان پیدا کر دیا ہے کہ ایک نئی ہندوستانی تہذیب کی عمارت پہلے سے کہیں زیادہ وسیع اور مضبوط بنیاد پر قائم ہو سکے یعنی ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار علاقائی زبانوں کے ساتھ ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں ایک مشترک زبان بول چال کی زبان کی حیثیت سے پھیلنے لگی اور صرف چند مخصوص طبقوں ہی میں نہیں بلکہ عوام میں بھی مقبول ہونے لگی۔'' اس زبان کا ڈھانچہ عہد متاخر کی ہندی آریائی بولی (اپ بھرنش) سے بنا تھا جو دلّی کے آس پاس بولی جاتی تھی اور جسے تیرھویں صدی کے شروع میں ہندوستان کے ترک فاتحوں نے یہاں کے لوگوں سے معمولی بات چیت کرنے کا ذریعہ بنایا تھا۔ دربار دہلی کے تعلق سے اسے معیاری زبان کی حیثیت حاصل ہوگئی اور یہ کھڑی بولی کہلانے لگی۔(1) سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں یہ زبان جو فارسی رسم خط میں لکھی جاتی تھی فارسی لفظوں سے بھرپور تھی اور فارسی ادب سے فیض اٹھاتی تھی۔' (2) ترقی کر کے ادبی زبان بن گئی لیکن مغربی ہندی کے علاقے میں جب بہت سے ہندوؤں نے اٹھارھویں صدی میں کھڑی بولی میں لکھنا شروع کیا۔'' تو اس رجحان کو جو یہ زبان اپنے دیسی ہندی اور سنسکرت لفظوں کی طرف رکھتی تھی قائم رکھا اور دیسی دیوناگری رسم الخط اختیار کیا۔'' (3) اس طرح وہ زبان وجود میں آئی جسے ہندی (یا شمالی ہند کے مدھیہ پردیش کی بہت سی بولیوں سے جو ہندی کے اسم نوعی سے پکاری جاتی ہیں، تمیز کرنے کے لیے اونچی ہندی یا ادبی ہندی) کہتے ہیں۔ '' اس طرح ایک زبان سے دو ادبی(4) زبانیں پیدا ہوگئیں جن کے رسم خط اور اونچے خیالات کو ظاہر کرنے والے الفاظ الگ الگ ہیں۔'' (5)

انیسویں صدی کے شروع تک اردو شمالی ہند میں بولی اور ادبی زبان دونوں کی حیثیت سے بہت مقبول ہو چکی تھی۔ مسلم علما قرآن مجید کا ترجمہ اردو میں کر چکے تھے اور ہندوؤں کی بہت سی مذہبی کتابیں بھی اس زبان میں لکھی جا چکی تھیں۔ لیکن سرکاری زبان مغلیہ سلطنت کے بچے کھچے حصے

میں اکثر ہندوستانی ریاستوں میں، جو سلطنت کے اقتدار سے آزاد ہو چکی تھیں ہنوز فارسی تھی۔ لیکن انگریز تاجر جواب شمالی ہند کے ایک بڑے حصے کے واقعی حکمران تھے، کچھ سیاسی اور کچھ عملی مصلحتوں سے یہ چاہتے تھے کہ فارسی کی جگہ کسی ہندوستانی زبان کو سرکاری کاموں کے لیے استعمال کریں۔ انھیں اپنے مقصد کے لیے اردو سب سے زیادہ کارآمد نظر آئی۔ مگر انھوں نے سوچا اردو کی مقبولیت کو بڑھانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسے فارسی سے ہٹا کر روزمرّہ بول چال کی زبان کھڑی بولی سے زیادہ قریب لایا جائے۔ چنانچہ فورٹ ولیم کالج میں جو 1800 میں کلکتے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہلکاروں کی ٹریننگ کے لیے قائم ہوا تھا ایک ادبی شعبہ اس غرض سے رکھا گیا کہ آسان اردو میں کتابیں لکھوائی جائیں تاکہ وہ مشترک زبان کے لیے (جو فارسی آمیز اردو سے تمیز کرنے کے لیے ہندوستانی کے نام سے موسوم کی گئی) نمونے کا کام دے سکیں۔ ہندوستانی کو ہندوؤں میں مقبول بنانے کے لیے فورٹ ولیم کالج میں کچھ ہندو لیکھک بھی رکھے گئے اور ان کی کتابیں دیوناگری رسم خط میں شائع کی گئیں جس سے شمالی ہند کے بہت سے ہندو آشنا تھے۔

1829 میں انگریزوں کی لسانی پالیسی بدل گئی اور انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ فارسی کی جگہ اردو کو نہیں بلکہ انگریزی کو سرکاری زبان بنائیں گے۔ چنانچہ ہندوستانی کی جو ہمت افزائی شروع ہوئی تھی وہ تھوڑے ہی دنوں میں ختم ہوگئی۔

اس وقت تک ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیبی زندگی میں وہ تفریقی رجحانات جن کا ہم نے پچھلے باب میں ذکر کیا تھا زبان کے معاملے میں ظاہر ہونے لگے تھے۔ مسلمانوں کو اور بہت سے ہندوؤں کو جنھوں نے فارسی زبان اختیار کرلی تھی۔ یہ محسوس ہوا کہ یہ زبان جس نے شاہی دربار کے گرم خانے میں پرورش پائی ہے ہندوستان کی سرزمین پر کھلی ہوا میں نہیں پنپ سکتی اس لیے انھوں نے اردو کو اپنانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن ان ہندوؤں نے جو ہندو قومیت کی تحریک سے متاثر تھے ادبی ہندی کو اپنی تہذیبی زبان بنایا چنانچہ اردو اور ہندی اپنی نئی ذمے داریوں کو جو ادبی زبانوں کی حیثیت سے ان پر عائد ہوتی تھیں، پورا کرنے کے لیے اس پر مجبور ہوگئیں کہ پہلی عربی فارسی سے اور دوسری سنسکرت سے بہت سے لفظ ادھار لے۔ اس طرح وہ ایک دوسرے سے اور زیادہ دور ہوگئیں۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندی کے حامیوں نے صوبۂ یو۔پی۔ اور بہار میں ایک مہم اس غرض سے شروع کی کہ اردو کی جگہ ہندی کو (انگریزی کے ساتھ جو اصل سرکاری زبان تھی۔) ثانوی سرکاری زبان کی حیثیت دی جائے۔ ہندی اور اردو کی اس نزاع نے سیاسی تفریق پسندی کے رجحان کو اگر جنم نہیں دیا تو پروان ضرور چڑھایا۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد مہاتما گاندھی نے چند ماہرین لسانیات کی مدد سے اس نزاع کو دور کرنے کے لیے یہ کوشش کی کہ عام بول چال کی زبان جو شمالی، مغربی اور وسطی ہند اور ایک حد تک باقی ملک میں رائج ہے، جسے دیس کی ایک تہائی آبادی بولتی اور آدھی سے زیادہ آبادی سمجھتی ہے قومی زبان بنائی جائے۔ ان کی تجویز تھی کہ یہ زبان ہندوستانی کہلائے، اردو اور ناگری دونوں طرح کے حرفوں میں لکھی جائے اور ہر شخص دونوں رسم خط سیکھے تاکہ حسب ضرورت دونوں سے کام لے سکے۔ وہ ہندوستانی کے محدود ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ اس طرح کرنا چاہتے تھے کہ عربی، فارسی یا سنسکرت سے الفاظ ادھار لینے کے بجائے بول چال میں آنے والے لفظوں کی تصریف یا ترکیب سے نئے لفظ بنالیے جائیں یا پرانے لفظوں کے مفہوم کو وسعت دے دی جائے۔ اس تحریک کو ملک کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی نیشنل کانگریس کی تائید حاصل ہوگئی اور اس نے اسے اپنے سیاسی پروگرام میں شامل کرلیا۔ الٰہ آباد کی ہندوستانی اکادمی اور وردھا کی ہندوستانی پرچار سبھا نے اس سلسلے میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔ جب صوبوں میں حکومت خود اختیاری رائج ہوگئی اور 11 میں سے 9 کانگریسی حکومتیں قائم ہوئیں تو حکومت بہار نے ہندوستانی کی علمی اور فنی اصطلاحیں بنوانے اور درسی کتابیں لکھوانے کے معاملے میں ہراول کا کام کیا۔ انگریزی اور ہندی کے حامیوں اور سب سے زیادہ اردو کے پرستاروں نے جن کی پشت پر مسلم لیگ تھی۔ ہندوستانی زبان کی تحریک کی بڑی سختی سے مخالفت کی۔ آگے چل کر جب آزاد ہند کی آئین ساز اسمبلی میں مرکزی حکومت کی سرکاری زبان کا سوال اٹھا تو ہندی اور ہندوستانی کی لڑائی پھر بڑے زور شور سے چھڑ گئی۔ لیکن ملک کی تقسیم اور اس کے بعد کے افسوسناک فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے بہت سے کانگریسیوں کا رویّہ بدل گیا تھا اور ہندوستانی کے سب سے بڑے حامی مہاتما گاندھی دنیا سے اٹھ چکے تھے اس لیے وہ آئین ساز اسمبلی میں ووٹوں کی اکثریت حاصل نہ

کرسکی اور ہندی زبان دیوناگری حروف میں مرکزی حکومت کی زبان یا دوسرے الفاظ میں قومی زبان تسلیم کرلی گئی مگر اس شرط کے ساتھ کہ ہندی کو بول چال کی زبان (ہندوستانی) سے قریب رکھنے کی کوشش کی جائے۔

ہندوستان کے دستور کی جو دفعات زبان کے مسئلے سے تعلق رکھتی ہیں ان میں سب سے اہم یہ ہیں:

343 (1) یونین کی سرکاری زبان ہندی ہوگی۔ دیوناگری رسم خط میں۔ ہندسوں کی جو شکل سرکاری مقاصد کے لیے استعمال ہوگی وہ ہندی ہندسوں کا بین الاقوامی روپ ہے۔

(2) شق (1) میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کے باوجود دستور کے آغاز سے 15 سال تک انگریزی ان سب مقاصد کے لیے استعمال ہوتی رہے گی جن کے لیے وہ اس آغاز کے فوراً پہلے استعمال ہوتی تھی۔

مگر صدر جمہوریہ کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ مذکورہ بالا مدت کے اندر کسی سرکاری مقصد کے لیے انگریزی زبان اور ہندی ہندسوں کے بین الاقوامی روپ کے علاوہ ہندی زبان اور ہندی ہندسوں کی بھی اجازت دے دے۔

(3) اس دفعہ میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کے باوجود پارلیمنٹ قانون کے ذریعے سے ان مقاصد کے لیے جن کی صراحت اس قانون میں ہو یہ قرار داد کرسکتی ہے کہ 15 سال کے بعد (ا) انگریزی زبان، (ب) ہندسوں کے دیوناگری روپ، کا استعمال کیا جائے۔

345 دفعہ 346 اور 347 کی قراردادوں کا لحاظ رکھے ہوئے کسی ریاست کی قانون ساز مجلس قانون کے ذریعے ان زبانوں میں ریاست میں استعمال ہوتی ہیں۔ ایک زبان یا ایک سے زیادہ زبانوں کو یا ہندی کو ریاست کے کسی مقصد یا کل مقاصد کے لیے اختیار کرسکتی ہے۔

مگر جب تک ریاست کی قانون ساز مجلس قانون کے ذریعے اس کے خلاف فیصلہ نہ کرے انگریزی زبان ریاست کے اندراج سرکاری مقاصد کے لیے استعمال ہوتی رہے گی جن کے لیے وہ دستور کے آغاز سے فوراً پہلے استعمال ہوتی تھی۔

346 جس زبان کو بالفعل یونین میں سرکاری مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی اجازت دی گئی ہو وہی ایک ریاست اور دوسری ریاست نیز ایک ریاست اور یونین کے درمیان مراسلت کا ذریعہ ہوگی۔ لیکن اگر دو یا دو سے زیادہ ریاستیں اس بات پر متفق ہوں کہ ان کے درمیان مراسلت کے لیے سرکاری زبان ہندی ہونی چاہیے تو ہندی اس قسم کی مراسلت کے لیے استعمال کی جاسکتی ہے۔

347 اگر اس بات کا مطالبہ کیا جائے اور صدر جمہوریہ کو یہ اطمینان ہوجائے کہ کسی ریاست کی آبادی کا معقول حصہ یہ چاہتا ہے کہ جو زبان وہ بولتا ہے اس کے استعمال کو ریاست تسلیم کرلے، تو صدر ہدایت کرسکتا ہے کہ وہ زبان بھی پوری ریاست یا اس کے حصے میں ان مقاصد کے لیے جن کی اس نے صراحت کی ہو تسلیم کرلی جائے۔

351 یونین کا فرض ہوگا کہ وہ ہندی زبان کو رواج دینے کی کوشش کرے اس اس طرح نشو و نما دے کہ وہ ہندوستان کی مرکب تہذیب کے کل عناصر کے لیے اظہار کا ذریعہ بن سکے اور اپنی روح کو قائم رکھتے ہوئے ہندوستانی اور ہندوستان کی دوسری ضمیمہ 8 میں گنوائی ہوئی زبانوں کے لفظوں، ترکیبوں، طرزوں اور اسلوبوں کو اپنالے اور جب بھی ضروری ہو تو اولاً سنسکرت اور ثانیاً دوسری زبانوں سے الفاظ لے لے۔

□□□

ہندوستان کا صنعتی ارتقا

مصنف: ڈاکٹر ڈی. آر. گیڈگل، پروفیسر ایم. صدیقی

ہندوستان کی تاریخ میں 1857 ایک اہم سنگِ میل ہے۔ اس سال نہ صرف ملک پر پوری طرح سے انگریز قابض ہوگئے بلکہ اسی کے بعد ہندوستانیوں کی خود احتسابی کا دور بھی شروع ہوا جس کے نتیجے میں مختلف اصلاحی تحریکات وجود میں آئیں اور ملک نشاۃ الثانیہ سے ہم کنار ہوا۔ 1857 کے بعد سے وہی صحیح معنوں میں ہندوستان کی صنعتی ترقی بھی شروع ہوئی۔ اس کتاب میں 1860 سے 1939 تک ملک کے صنعتی ارتقا کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

صفحات: 343، قیمت: -/130 روپے

اردو خبر نامہ

اردو کے فروغ میں رہنما کردار ادا کر رہی ہے قومی اردو کونسل: کپل سبل

● نئی دہلی ۔27مارچ، اردو کے فروغ کے لیے ایک نئے ایجنڈے کی ضرورت ہے اور قومی اردو کونسل اس سمت میں رہنما کردار ادا کر رہی ہے جس نے اطلاعاتی تکنالوجی سے اس قومی زبان کا رشتہ جوڑ کر اس کی ترقی میں مہمیز لگانے کو اپنا مشن بنا رکھا ہے۔ ان خیالات آج یہاں جسولہ علاقے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے نئے صدر دفتر کے افتتاح کے موقعے پر انسانی وسائل کے فروغ کے مرکزی وزیر کپل سبل نے اپنے ایک پیغام میں کیا۔ 'فروغ اردو بھون' کا افتتاح انھیں کو کرنا تھا لیکن وہ کسی اہم سرکاری مصروفیت کی وجہ سے نہیں آسکے۔ ان کا پیغام کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے پڑھ کر سنایا۔ ہائر ایجوکیشن کی جوائنٹ سکریٹری ڈاکٹر انیتا بھٹناگر نے کپل سبل کی نیابت کی۔ مسٹر سبل نے کہا کہ اردو زبان کا قرض اتارنے کے وہ پابند ہیں جو اس ملک کی تہذیب سے جڑی ہوئی ہے اور تاج محل، لال قلعہ اور قطب مینار اس وابستگی کی شہادتیں ہیں۔ انھوں نے نامساعد حالات میں بھی اپنی زبان کو زندہ اور تابندہ رکھنے پر اردو والوں کو قابل مبارکباد قرار دیتے ہوئے کہا کہ اردو کے فروغ میں بجٹ میں کوئی کمی نہیں ہوگی بلکہ اس میں اور اضافہ کیا جائے گا۔ تین کروڑ ستر لاکھ کی لاگت سے تعمیر شدہ تین منزلہ 'فروغ اردو بھون' کی افتتاحی تقریب کی صدارت ممتاز اردو صحافی اور پارلیمانی رکن احمد سعید ملیح آبادی نے کی جنھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں اردو کے حقیقی فروغ پر زور دیا اور کہا

'فروغ اردو بھون': دہلی میں اردو کا نیا مرکز

27 مارچ، 2010 کا دن قومی اردو کونسل کی تاریخ کا ایک اہم ترین دن تھا۔ اس روز کونسل کے وہ صدر دفاتر جو ویسٹ بلاک، آر کے پورم کی الگ الگ عمارتوں میں کام کر رہے تھے کونسل کی اپنی عمارت 'فروغ اردو بھون' میں منتقل ہو گئے۔ یہ جدید وضع کی سہ منزلہ عمارت، جس کی تعمیر پر 3 کروڑ 70 لاکھ روپئے کا خرچ آیا، 21 نومبر 2005 کو بلڈنگ پلان کی منظوری ملنے کے بعد تقریباً چار سال میں بن کر تیار ہوئی۔

'فروغ اردو بھون' نئی دہلی کے علاقہ جسولہ میں، اپولو ہسپتال کے نزدیک انسٹی ٹیوشنل ایریا میں واقع ہے۔ یہ مقام اوکھلا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی وسیع اردو آبادی کے کافی قریب ہے۔ پوری طرح ایئر کنڈیشنڈ 'فروغ اردو بھون' میں قومی اردو کونسل کا تمام نظم ونسق اب ایک مرکز پر آگیا ہے جس سے کونسل کے مختلف شعبوں میں باہمی ربط ضبط آسان ہوگیا ہے۔ اس سے کونسل کی کارکردگی بھی یقینی طور پر مزید بہتر ہوگی۔ صرف کونسل کی مطبوعات کا شوروم آر کے پورم کی پرانی عمارت میں رہنے دیا گیا ہے لیکن کونسل کی کتابوں اور رسالوں کی فروخت کا شعبہ نئی عمارت میں آگیا ہے۔ کونسل کے ماہنامہ 'اردو دنیا' اور سہ ماہی جریدے 'فکر وتحقیق' کی ادارت کا شعبہ اور ایک عمدہ لائبریری کے ساتھ کونسل کا کمرۂ استقبالیہ نئی عمارت کے گراؤنڈ فلور پر واقع ہے۔ پہلی منزل پر کونسل کے ڈائرکٹر کے کمرے کے ساتھ ایک کانفرنس روم بنایا گیا ہے اور انتظامیہ کے دفاتر بھی اسی فلور پر واقع ہیں۔ کونسل کی مطبوعات اور ان کی فروخت کے دفتروں کے ساتھ تکنیکی تعلیم، فاصلاتی تعلیم اور گرانٹ ان ایڈ کے دفتر دوسرے فلور پر قائم کیے گئے ہیں۔ تیسرے فلور پر کونسل کے وائس چیئرمین کا کمرہ ہے اور ایک آڈیٹوریم بنایا گیا ہے جس میں سمینار، ورکشاپ، سمپوزیم جیسی ادبی تقریبات کا اہتمام کیا جاسکتا ہے۔ امید کی جانی چاہیے کہ لائبریری اور آڈیٹوریم کی بدولت 'فروغ اردو بھون' قومی راجدھانی دہلی میں اردو کے ایک نئے مرکز کے طور پر ابھرے گا اور تمام اردو والوں کے کام آئے گا۔

کہ سنٹرل اسکولوں میں اردو کی تعلیم میں منتقلی کے ساتھ ادارہ اور فعال ہوگا۔ ممتاز اردو نقاد اور دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اس توقع کے ساتھ کہ اردو کو اب اپنے ہی گھر میں بے گھری کی شکایت نہیں رہے گی ،کہا کہ ابھی بھی اردو کے ساتھ انصاف کی جدو جہد جاری ہے اور سہ لسانی فارمولے میں اردو کی پوزیشن کو مستحکم بنانے کی ضرورت ہے۔ ماہر اسلامیات پروفیسر اختر الواسع نے اردو کو رفتار زمانہ سے ہم آہنگ کرنے اور اسے 21 ویں صدی کی زبان بنانے میں قومی اردو کونسل کے کردار کو سراہا اور کہا کہ یہ اردو کا ہی کمال ہے کہ آج بھی اس کے بے پایاں فروغ کے اہم کرداروں میں ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ، چندر بھان خیال اور پروفیسر گوپی چند نارنگ جیسے لوگ پیش پیش ہیں جن کی مادری زبان اردو نہیں۔ قبل ازیں مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کونسل کے وائس چیئرمین چندر بھان خیال نے اپنی مختصر تقریر میں ادارے کی کارکردگی پر روشنی ڈالی اور جاری سرگرمیوں پر اظہار خیال کے ساتھ امکانات کا جائزہ لیا۔ اس موقعے پر جلسۂ تقسیم اسناد کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ جس میں کیلیگرافی اور گرافک ڈیزائن کمپیوٹر ایپلیکیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی ٹی پی کے فارغین میں اسناد تقسیم کی گئیں۔ دیگر شرکا میں آصف محمد خاں (ایم ایل اے)، ارتضیٰ کریم، منصور عثمانی شامل تھے۔

(صحافت، دہلی)

تعلیم ہی ملک کی ترقی کی کلید: منموہن سنگھ

● نئی دہلی۔ آج جب کہ حق تعلیم ایکٹ کا نفاذ ہو رہا ہے۔ وزیر اعظم منموہن سنگھ نے تعلیم تک سبھی کی رسائی کو ممکن بنانے کے لیے قومی سطح پر پوری تندہی سے کام کرنے پر زور دیا۔ اس موقعے پر ٹیلی ویژن پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے یقین دلایا کہ اس ایکٹ کے نفاذ میں فنڈ کی کمی ہونے نہیں دی جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ سبھی کو تعلیم مہیا کرانے کی کوششوں میں دلتوں، اقلیتوں اور لڑکیوں پر خاص توجہ دی جائے گی۔ وزیر اعظم نے کہا کہ اس ایکٹ کا نفاذ اس بات کا مظہر ہے کہ حکومت نے تعلیم حاصل کرنے کے عوام کے بنیادی حق کو حقیقت بنانے کا پختہ عزم کر رکھا ہے۔ ڈاکٹر سنگھ نے کہا کہ تعلیم ملک کی ترقی کی کلید ہے، اس لیے ریاستی حکومتوں، اساتذہ، سرپرستوں اور ملک کے تمام دیگر طبقوں کا فرض ہے کہ وہ اس ایکٹ کے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے پوری لگن اور ایمانداری کے ساتھ کام کریں۔

وزیر اعظم نے اس کام میں اساتذہ کے کردار کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان کی اہلیت اور لگن اس مقصد کے حصول میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس لیے انھیں ایسے ماحول میں کام کرنے کا موقع ملنا چاہیے جہاں وہ آزادی اور وقار کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے سکیں۔ خود اپنی زندگی اور تجربوں کا ذکر کرتے ہوئے وزیر اعظم نے کہا کہ ان کا تعلق ایک ایسے خاندان سے رہا ہے جس کے وسائل محدود تھے۔ وہ بہت دور پیدل چل کر اسکول جاتے تھے اور مٹی کے تیل کے لیمپ میں پڑھتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں آج جو بھی ہوں تعلیم کی بدولت ہوں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تعلیم کی روشنی سبھی تک پہنچے۔ ڈاکٹر سنگھ نے کہا کہ ہر بچے کو، خواہ اس کا تعلق کسی بھی طبقے سے ہو، تعلیم تک رسائی ہونی چاہیے، انھوں نے کہا کہ ان کی خواہش ہے کہ ہر ہندوستانی بہتر مستقبل کا خواب دیکھے اور اسے پورا کرنے میں کامیاب ہو۔ وزیر اعظم نے کہا کہ آج سے تقریباً سو سال پہلے ملک کے ایک عظیم سپوت گوپال کرشن گوکھلے نے برطانوی دور کی قانون ساز اسمبلی سے ہندوستانی عوام کو حق تعلیم دلانے کی اپیل کی تھی اور تقریباً 90 سال کے بعد اس حق تعلیم کو بنیادی حق کا درجہ دینے کے لیے آئین میں ترمیم کی گئی۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

قومی اردو کونسل کلاسیکی ادب کے درست متن شائع کرے گی: محمد حمید اللہ بھٹ

● نئی دہلی۔ 10 اپریل، قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ نے کہا کہ اردو کونسل کلاسیکی ادب کی اشاعت کے سلسلے میں زیادہ سے زیادہ کام کرنا چاہتی ہے اور اردو کے جتنے بھی کلاسیکی شعرا اور نثر نگار ہیں ان پر تحقیقی، تنقیدی کام کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ قومی اردو کونسل کے دفتر 'فروغ اردو بھون' کے کانفرنس ہال میں کل ایک پانچ روزہ ورکشاپ کی افتتاحی نشست سے خطاب کر رہے تھے۔ یہ ورکشاپ 'کلیات سودا' مرتبہ: محمد حسن کی اشاعت ثانی کا درست مسودہ تیار کرنے کے لیے منعقد کی گئی۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے کہا کہ کلاسیکی اردو ادیبوں کی نثری تصانیف اور شعری دواوین کے درست نسخے تنقیدی اور تحقیقی نظر سے مرتب کر کے سلیقے سے چھاپنا بہت ضروری ہے اور اسی مقصد سے کونسل نے ورکشاپوں کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ نے بتایا کہ اردو کے 50 کلاسیکی شعرا اور 50 کلاسیکی نثر نگاروں کی

ایک فہرست تیار کر کے اس سلسلے میں بڑے پیانے پر کام کیا جائے گا اور قومی اردو کونسل چاہتی ہے کہ یہ کام 2012 تک مکمل ہو جائے۔ انھوں نے کہا کہ اس سلسلے میں ہندوستان کے مختلف شہروں سے ماہرین کو مختلف کتابی نسخوں کی ترتیب کے لیے ورکشاپوں میں بلایا جائے گا۔ 5 اپریل سے شروع ہونے والے ورکشاپ میں، پروفیسر اسلم پرویز، پروفیسر نسیم احمد، پروفیسر محمد ذاکر اور ڈاکٹر احمد محفوظ نے شرکت کی۔ پروفیسر ظفر احمد صدیقی علی گڑھ اور پروفیسر حنیف نقوی بنارس طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے شریک نہیں ہو سکے۔ ورکشاپ میں کلیات سودا کا نسخہ جانسن (قلمی) کے عکس سے موازنہ کر کے متن کی تصحیح کی گئی۔ علاوہ ازیں مثنویات، مخمسات اور فارسی غزلوں کا بہ غور مطالعہ کر کے ضروری تصحیحات کی گئیں۔ یہ کلیات دو جلدوں میں شائع کرنے کی تجویز ہے۔

(صحافت، دہلی)

طنز و مزاح کے بغیر کسی زبان کے ادب کا تصور ممکن نہیں: گوپی چند نارنگ

ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام 'اردو ادب میں طنز و مزاح' کے موضوع پر سہ روزہ سیمینار کا انعقاد

● نئی دہلی، 19 مارچ۔ طنز و مزاح ادب کا ضروری حصہ ہے اس کے بغیر کسی زبان کے ادب کا تصور ہی ممکن نہیں۔ زندگی کی شدت اور سختیوں کو گوارہ بنانے کے لیے زندہ دلی، شگفتگی اور شوخی کی راہ کھلی رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اسی طرح معاشرہ کی کجیوں اور بوالعجبیوں پر طنز کے ذریعے ہی کارگر وار کیا جا سکتا ہے۔ اردو زبان و ادب کے ممتاز نقاد اور دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ساہتیہ اکادمی کی جانب سے 'اردو ادب میں طنز و مزاح' کے موضوع پر منعقدہ سہ روزہ قومی سیمینار کی صدارت کرتے ہوئے اپنے ان خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ معاشرے کی اصلاح کے لیے کوئی دوسرا ادبی حربہ اتنا کارگر نہیں جتنا طنز و مزاح۔ سماجی بے انصافی کے خلاف ہمیشہ طنز کو ہتھیار بنایا گیا ہے جس کا وار کبھی خالی نہیں جاتا۔ انھوں نے کہا کہ دنیا کے عظیم ادیبوں اور شاعروں کے یہاں یہ عنصر فطری طور پر ان کے اعلیٰ ادب کا حصہ ہے۔ شیکسپیئر، غالب اور کالی داس سامنے کی مثالیں ہیں۔ لیکن وہ شاعر اور ادیب جو فقط طنز و مزاحیہ ادب کے لیے خود کو وقف کر دیتے ہیں اکثر و بیشتر اُن کی درجہ بندی الگ کی جاتی ہے۔ تاہم طنز و مزاح کے ادیب ادب میں تیسرے درجے کے شہری نہیں، اگر انھوں نے اعلیٰ ادبی معیاروں کی پاسداری کی ہے تو وہ اُسی ادبی مقام کے مستحق قرار پاتے ہیں جو شعر و ادب کی دوسری اصناف کے اعلیٰ ادیبوں کے لیے مقرر ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے عہد میں رشید احمد صدیقی، کنہیا لال کپور، راجہ مہدی علی خاں، رضا نقوی واہی، کرنل محمد خاں یا مشتاق احمد یوسفی کا مقام و مرتبہ کسی دوسرے اعلیٰ ادیب یا شاعر سے کم نہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ادھر ہندوستان کے اردو ادب میں طنز و مزاح پر توجہ کم ہے۔ ملک کے اردو اخباروں، رسائل و جرائد، نیز ملک کی اردو اکادمیوں کو چاہیے کہ ایسے ادیبوں کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی کی جائے۔ اس سے قبل سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے جناب مجتبیٰ حسین نے کہا کہ میں مرزا غالب کو طنز و مزاح نگاری کا پہلا شاعر مانتا ہوں۔ غالب جدید طنز و مزاح کے امام ہیں انھوں نے اردو ادب کو بے مثال شاہکاروں سے روشناس کرایا۔ غالب نے نامساعد حالات میں بھی اپنے آپ پر ہنسنے کی بے مثال روایت قائم کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ظرافت کے لیے آدمی کا ظریف ہونا ہی ضروری نہیں بلکہ باظرف ہونا بھی ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ ساہتیہ اکادمی نے طنز و مزاح کو اس کا بھرپور منصب دلانے کی کوشش کی ہے۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے جناب نصرت ظہیر نے کہا کہ اردو طنز و مزاح نگار تنقید نگاروں کو خواہ کتنا ہی تضحیک کا نشانہ بنائیں لیکن بغیر تنقید کے طنز و مزاح اپنے مرتبے کو نہیں پہنچ پائے گا۔ اردو میں طنز و مزاح پر ابھی تک تنقید نگاروں کی نگاہ نہیں پہنچ سکی ہے خصوصاً ہم عصر طنز و مزاح پر۔ افتتاحی اجلاس کے آغاز میں ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری اے کرشنا مورتی نے خیر مقدمی کلمات پیش کیے جبکہ افتتاحی اجلاس کے اختتام پر جناب عنبر بہرائچی، کنوینر اردو مشاورتی بورڈ ساہتیہ اکادمی نے سیمینار میں آئے تمام مندوبین کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا۔

افتتاحی اجلاس کے بعد تنقید و تجزیہ کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی۔ انھوں نے کہ طنزیہ مزاحیہ ادب کتنا کامیاب ہے اس کا پیمانہ تنقیدی مضامین نہیں بلکہ یہ ہے کہ طنز و مزاح کا اسلوب، لفظیات اور لہجے کا اثر تنقید پر کتنا پڑتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ تمام اصناف پر سوالات اٹھتے رہے ہیں اس لیے طنز و مزاح کے تعلق سے اصطلاحات کے چکر میں نہ پڑیں بلکہ صحت مند خطوط پر کام کریں۔ اس اجلاس میں پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے 'کلاسیکی اردو شاعری میں طنز و مزاح کی روایت'، سید مصطفیٰ کمال نے 'طنز و مزاح اور انشائیہ' اور ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے 'اردو طنز و مزاح: اکبرالٰہ آبادی سے دلاور فگار تک' کے عنوانات سے اپنے مقالات پیش کیے۔ ظہرانے کے بعد نثری نشست کی صدارت سید ضمیر حسن دہلوی نے کی جس میں فیاض

احمد فیضی نے 'ماہر تعلیم' اور عظیم اختر نے 'عزت اُسے ملی جو' اور معین اعجاز نے 'اصلی سیکولرزم بمقابلہ نقلی سیکولرزم' کے عنوانات سے اپنے طنزیہ مزاحیہ مضامین پیش کیے۔ آخر میں شعری نشست کی صدارت کرتے ہوئے عنبر بہرائچی نے کہا کہ طنز و مزاح کی شعری روایت کو زندہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس نشست میں پاپولر میرٹھی، غوث خواہ مخواہ، ظفر کمالی، مختار ٹونکی، مصطفیٰ علی بیگ، مسرور شاہجہاں پوری اور سنیل کمار تنگ نے اپنے مزاحیہ کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

سیمینار کے دوسرے دن کے پہلے اجلاس میں ممتاز ناقد اور دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے آئرنی اور طنز پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ آئرنی ایک اصطلاح ہے جو جدیدیت کے زمانے میں خوب استعمال ہوئی، آئرنی میں درد کی لہر چلتی ہے لیکن جب لفظ کے لغوی معنی کسی اظہار میں آکر ساخت کے اعتبار سے یا نحوی اعتبار سے بدل جاتے ہیں تو طنز بنتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں محدود اصطلاح کو ادب میں استعمال کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ انھوں نے کہا کہ منٹو المناک مزاح کا بادشاہ ہے۔ 'کھول دو'، 'ٹٹوال کا کتا'، 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' اور 'سیاہ حاشیے' اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ادیب طنز سے نشتر سے سماج کو آئینہ دکھانے کا کام کرتا ہے۔ منٹو نے بھی یہی کام کیا ہے۔ اس کے جینیس میں آرٹ کے کئی جہات ہیں۔ پروفیسر نارنگ نے کہا کہ کرشن چندر کا معاملہ فکشن میں وہی ہے جو شاعری میں میر تقی میر کا ہے۔ پہلے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے ڈاکٹر سید تقی عابدی نے کہا کہ جو چیز غالب کی شخصیت میں اضافہ کرتی ہے وہ ان کی اعلیٰ ظرافت ہے۔ اکبر الہ آبادی کے بعد اگر کوئی بڑا طنز و مزاح کا شاعر ہے تو وہ ہیں سید محمد جعفری۔ سید محمد جعفری نے اکبر کی پیروی کی ہے۔ جعفری کے طنز و مزاح کا تعلق اکبر الہ آبادی کے پہلے جعفر زٹلی سے جا ملتا ہے۔ سید محمد جعفری نے سماجی شعور کو بیدار کرنے کا کام کیا ہے۔ اس اجلاس میں فیاض رفعت 'اردو میں طنزیہ و مزاحیہ کالم نگاری: اودھ پنچ سے تقسیم ہند تک'، الیاس شوقی نے 'اردو نثر میں طنز و مزاح کا بنیاد گزار غالب' اور امام اعظم نے 'اردو میں طنزیہ مزاحیہ کالم نگاری: تقسیم ہند کے بعد کا منظرنامہ' کے عنوانات سے مقالے پیش کیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے فرمایا کہ اس سیمینار کی خصوصیت یہ ہے کہ طنز و مزاح پر صرف تنقیدی مضامین ہی نہیں جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے بلکہ طنزیہ اور مزاحیہ نثری و شعری تخلیقات بھی پیش کی جا رہی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ طنزیہ مزاحیہ ادب کے لیے بھی فکشن اور شاعری کی طرح زبان کا ہونا ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ مزاح نگاری میں تاثیر تہذیبی شعور سے آتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ نقاد کا کام یہ ہے کہ تخلیق کار اور قاری و سامع کے درمیان پل کا کام کرے۔ اس اجلاس میں منظور عثمانی نے 'اردو طنز و مزاح کے شمس و قمر کو ایک ناچیز کا سلام' اور ساجد رشید نے 'اردو افسانہ میں طنز و مزاح' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا جبکہ پورن سرین نے ٹیلی ویژن اور طنزیہ مزاحیہ ادب پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ اس اجلاس میں مقالوں کے بعد الیکٹرانک میڈیا اور طنز و مزاح پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ جو چیز کمرشیلائزڈ ہو جاتی ہے وہ ذلیل ہو جاتی ہے۔ یونیورسٹیوں میں ماس کمیونی کیشن کو ری فارم کرنے کی ضرورت ہے۔ ایسے ادیبوں کو آگے آنے کی ضرورت ہے جو اسکرین پلے اور اسکرپٹ رائٹنگ میں مہارت حاصل کریں۔ ڈاکٹر مولا بخش نے مقالوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ فکشن کے فارم کو استعمال کیے بغیر شاعری میں یا کسی بھی صنف میں مزاح پیدا نہیں کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ طنز و مزاح کے متون کو سامنے رکھ کر سیریل بنایا جائے تاکہ متن کی معنویت برقرار رہے اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہیں کیا جائے۔ پروفیسر بیگ احساس نے کہا کہ کرشن چندر کے یہاں اسلوب کے دھارے میں طنز شامل ہے۔ منٹو اور عصمت کے مقابلے کرشن چندر کے یہاں طنز زیادہ ہے۔

لنچ کے بعد نثری نشست کی صدارت پروفیسر صغریٰ مہدی نے کی جس میں مجتبیٰ حسین نے 'ہماری بے مکانی دیکھتے جاؤ'، پروفیسر خالد محمود نے 'سٹی بس کا سفر'، اسد رضا نے 'گھریلو شوہر' اور ڈاکٹر حلیمہ فردوس نے 'چچا چھکن کے سیل فون کی تلاش' کے عنوانات سے اپنے طنزیہ و مزاحیہ مقالات پیش کیے۔

شعری نشست پر مبنی آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کی جس میں سید طالب خوندمیری، متین امروہوی، اسرار جامعی، امیر احمد ممکن اور اقبال فردوسی نے اپنے طنزیہ و مزاحیہ کلام سے سامعین کو لطف اندوز کیا۔ آخر میں عنبر بہرائچی نے مندوبین اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

سیمینار کے آخری دن کے پہلے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر وہاب اشرفی نے کہا کہ اگر اردو میں کوئی صنف موجود ہے جو بہتر طور پر اپنی تہذیب و ثقافت کی تصویر کشی کر سکتی ہے تو وہ طنز و مزاح ہے۔

طنز و مزاح ملفوبہ ہے، آپ آزاد ہیں کہ کسی بھی فارم میں طنز و مزاح کا استعمال کریں۔ طنز و مزاح اول درجے کا ادب ہے اور طنز و مزاح نگار حقیقت پسند ہوتے ہیں۔ اس اجلاس میں پروفیسر بیگ احساس نے 'اردو طنز و مزاح اور فکشن: کرشن چندر اور عصمت کے حوالے سے'، ڈاکٹر نسیم احمد نسیم نے 'اردو میں مزاح نگاری: پطرس اور شفیق الرحمٰن کے حوالے سے' اور حقانی القاسمی نے 'طنز و مزاح میں تنوع' کے عنوان سے اپنے مقالے پیش کیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کی جس میں ڈاکٹر مولا بخش نے 'اردو کی طنزیہ و مزاحیہ نثر معاصر منظرنامہ' پر اور سیفی سرونجی نے 'اردو طنز و مزاح اور کنہیا لال کپور' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔

تیسرے اجلاس کی صدارت نظام صدیقی نے کی جس میں منظور عثمانی نے 'اب عناصر میں اعتدال کہاں' اور عباس متقی نے 'کچرا' کے عنوانات سے اپنے طنزیہ و مزاحیہ تخلیقات پیش کیں اور چوتھے اجلاس کی صدارت نریندر لوتھر نے کی جس میں نصرت ظہیر کے نثر پارے 'جوتے کی صحافت' کو ظفر کمالی نے پڑھ کر سنایا۔ سیمینار کے آخر میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ اس سیمینار نے واضح کردیا ہے کہ طنز و مزاح نگاروں کو احساس کمتری میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ طنز و مزاح نگاری ایک حوصلہ مندی کی فضا پیدا کرتی ہے۔ طنز و مزاح ہماری زندگی کا لازمی جزو ہے۔ اس کے بغیر ادب کا کوئی تصور نہیں کیا جاسکتا۔ آخر میں عنبر بہرائچی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ طنز و مزاح پر ساہتیہ اکادمی کا ایک تاریخی سیمینار ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ساہتیہ اکادمی کی ڈپٹی سکریٹری رینو موہن بھان نے بھی تمام مندوبین کا شکریہ ادا کیا۔ ساہتیہ اکادمی کے پروگرام آفیسر مشتاق صدف نے کہا کہ 'اردو ادب میں طنز و مزاح' سیمینار انتہائی کامیاب رہا اور اس کامیابی کا سہرا ان مزاحیہ اور طنزیہ نگاروں کو جاتا ہے جنھوں نے اس سہ روزہ قومی سیمینار میں شرکت کی۔ اس موقع پر اردو زبان و ادب کے ممتاز نقاد اور دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ پر ساہتیہ اکادمی کے زیراہتمام بنائی گئی دستاویزی فلم دکھائی گئی۔ جس کی ناظرین نے خوب پذیرائی کی اور کہا کہ پروفیسر نارنگ کی شخصیت اور جملہ خدمات پر بنائی گئی فلم قابل دید اور قابل تحسین ہے۔

اس سیمینار میں مہمان شرکا کے علاوہ جن اہم شخصیات نے شرکت کی اُن میں پروفیسر مشیرالحسن، ستیہ پال آنند، پروفیسر اخترالواسع، محترمہ منورما نارنگ، ڈاکٹر شہزاد انجم، نند کشور وکرم، رئیس احمد، ذیشان خاں، ایڈووکیٹ ایم قمرالدین، محترمہ رخشندہ جلیل، آرسی ورما ساحل، ڈاکٹر کوثر مظہری، جناب ابرار کرتپوری، ڈاکٹر وسیم بیگم، ڈاکٹر سید تنویر حسین، ظہیر احمد برنی، موسیٰ رضا، محمد ہادی رہبر، محترمہ دیبہ سلام، بیگم بیگ احساس، پروفیسر محمد نعمان خاں، منصور احمد عثمانی، زاہد عیش، اشفاق عارفی، معین شاداب، انور باری، ڈاکٹر سہیل انور، ڈاکٹر محمد کاظم، جاوید رحمانی، عرفان احمد وغیرہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ (پریس ریلیز)

دہلی کی اردو زبان سب سے شیریں: شیلا دکشت

● نئی دہلی۔ وزیر اعلیٰ شیلا دکشت نے دہلی میں بولی جانے والی اردو زبان کو سب سے شیریں قرار دیتے ہوئے کہا کہ حکومت اسے عام آدمی کی زبان بنانے کے لیے ہر ممکن تعاون کرے گی۔ اردو اکادمی کے ایوارڈ تقریب میں وزیر اعلیٰ نے ''ویل ڈن ابا'' فلم کی مثال پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس فلم میں استعمال کی گئی حیدرآبادی اردو زبان میں تیلگو کا اثر پایا جاتا ہے لیکن دہلی کی اردو زیادہ شیریں ہے۔ تقریب کی صدارت وزیر خوراک وصنعت ہارون یوسف نے کی اور وزیر صحت پروفیسر کرن والیہ بطور مہمان اعزازی شریک ہوئیں۔ شیلا دکشت نے کہا کہ اردو اکادمی کا کام صرف مشاعرے، سیمینار اور ڈرامے منعقد کرانا نہیں ہے بلکہ اس کا بنیادی مقصد اردو کی ترویج وترقی اور اس کا فروغ ہے۔ ہارون یوسف نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اردو اکادمی اپنے مقاصد پر ہی عمل پیرا نہیں بلکہ بہتر طریقے سے فرائض بھی انجام دے رہی ہے۔ میں اردو اکادمی کے فروغ میں ہر ممکن تعاون دیتا رہا ہوں اور آئندہ بھی اکادمی کی بہتری کے لیے جو بھی ممکن ہوسکے گا خوش اسلوبی کے ساتھ کروں گا۔

شریف الحسن نقوی نے کہا کہ وزیر اعلیٰ کی سرپرستی میں اردو اکادمی دہلی ہندوستان کی دوسری اکادمیوں کے مقابلے میں زیادہ فعال ثابت ہوئی ہے۔ پروگرام کی نظامت انیس اعظمی نے کی۔ اس موقعے پر 26 کتابوں کے مصنف پروفیسر مسعود حسن خاں کو کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ، 80 کتابوں کے مصنف خلیق انجم کو پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی ایوارڈ، 125 کتابوں کے مصنف ڈاکٹر کشمیری لال ذاکر کو ایوارڈ برائے تخلیقی نثر، اخبار انقلاب کی ادارت اور صحافت کے علاوہ ریڈیو کے متعلق تجربوں کے ساتھ ایک شعری مجموعے کی مصنفہ نور جہاں ثروت

کو ایوارڈ برائے شاعری اور ڈاکٹر بانو سرتاج کو ایوارڈ برائے بچوں کا ادب سے نوازا گیا۔ ان تمام ایوارڈ یافتگان کو وزیر اعلیٰ شیلا دکشت کے دست مبارک سے ایوارڈ پیش کیے گئے۔

تقریب میں پروفیسر نصیر احمد خاں، پروفیسر انیس اشفاق، پروفیسر شمس الحسن عثمانی، ڈاکٹر اسلم پرویز، ڈاکٹر خالد علوی، ڈاکٹر ظہیر انور، ڈاکٹر جی آر کنول، نرل سنگھ نرل، معصوم مرادآبادی، شہباز ندیم ضیائی، شمس رمزی اور این آر قاسمی نے خاص طور سے شرکت کی۔ آخر میں سکریٹری اردو اکادمی مرغوب حیدر عابدی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

پروفیسر اختر الواسع : دہلی اردو اکادمی کے نئے وائس چیئرمین

● نئی دہلی 9/اپریل۔ آج بعد نماز جمعہ اکادمی کے نئے وائس چیئرمین پروفیسر اختر الواسع نے چارج سنبھال لیا۔ ایک سادہ سی تقریب میں اکادمی کے سکریٹری جناب مرغوب حیدر عابدی نے پروفیسر اختر الواسع کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ ہماری خوش بختی ہے کہ ایک نہایت ہی فعال شخصیت اکادمی سے وابستہ ہوگئی۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں امید ہے کہ آپ کی آمد سے اکادمی کے کاموں میں اضافہ ہوگا اور ایک نئے عزم کے ساتھ اردو زبان وادب کی خدمت کے لیے سرگرم ہوں گے۔

اس موقع پر انیس اعظمی نے مبارک باد پیش کی اور کہا کہ پروفیسر اختر الواسع علمی و ادبی دنیا کا ایک معتبر نام ہے۔ ادب و تہذیب کے ساتھ ساتھ انتظام و انصرام کا بھی انھیں خاصا تجربہ حاصل ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور اس کی علمی و تہذیبی روایت کے نمائندے کے طور پر آپ پورے ملک میں جانے جاتے ہیں، ہم آپ کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

پروفیسر اختر الواسع نے دلی کی وزیر اعلیٰ محترمہ شیلا دکشت کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ انھیں جو کام ملا ہے وہ کوشش کریں گے کہ اسے بہتر طور پر انجام دیں۔ اس موقع پر انھوں نے سید شریف الحسن نقوی کا خصوصیت سے تذکرہ کیا اور کہا کہ ہم ان کے منصوبوں کو آگے بڑھائیں گے اور گزشتہ میں جو کچھ فیصلے ہوئے ہیں اور جو کمیٹیاں بنی ہیں وہ علی حالہ بحال رہیں گی اور جو کچھ ان کے ذمے کام ہے اس کے تئیں وہ آزاد ہیں۔

پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ ہم اکادمی کو اردو والوں کے درمیان لے جانا چاہتے ہیں اور دہلی کے ان حلقوں میں جہاں اردو والوں کی خاطر خواہ تعداد ہے ان کے درمیان جا کر ہم ان کی آراء بھی معلوم کریں گے تاکہ اکادمی کی سرگرمیاں مزید وسیع ہوسکے۔ اس موقع پر انھوں نے اس عزم کا بھی اعادہ کیا کہ دہلی کی سڑکوں پر اردو کے جو غلط بورڈ ہیں، ان کو درست کرایا جائے گا تاکہ دولت مشترکہ کھیلوں میں آنے والے اردو مہمانوں کے سامنے ہمیں شرمندگی کا احساس نہ ہو۔ انھوں نے ایک تجویز یہ بھی رکھی کہ اردو صحافیوں (پرنٹ و الیکٹرانک میڈیا) خصوصاً نامہ نگاروں کے لیے اکادمی ایک ورکشاپ کا انعقاد کرے۔ اس کے علاوہ پروفیسر واسع نے اردو کی سائنسی میراث پر بھی غور وفکر کی تجویز پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ اکادمی نے اب تک جو کام کیے ہیں وہ نہایت اہم اور گراں قدر ہیں۔ انھوں نے یہاں کے اسٹاف کی بھی تعریف کی اور کہا کہ اکادمی کے ہر پروگرام کو اس طرح انجام دیتے ہیں گویا وہ ان کا اپنا پروگرام ہو۔ اس موقع پر انھوں نے اکادمی کے دفاتر کا معائنہ کیا اور اس کے اسٹاف سے ملاقات کی۔

اس موقع پر پروفیسر خالد محمود، رؤف رامش، ایم۔ سلیم، شفیق الرحمن، مفتی مشتاق تجاروی، ڈاکٹر محمد خالد خان، ڈاکٹر محمد عمر فاروق، محمد غانم اور عمیر منظر وغیرہ موجود تھے۔ (پریس ریلیز)

بھساول میں قومی اردو کونسل دہلی کے اشتراک سے ٹیچرس کانفرنس

● بھساول، ضلع جلگاؤں (مہاراشٹر) میں 21-20 فروری کو ٹیچرس ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی بھساول کے زیر اہتمام اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے اشتراک سے دو روزہ اردو ٹیچرس کانفرنس و ورکشاپ کا انعقاد بی زیڈ اردو ہائی اسکول و جونیئر کالج، بھساول کے پرنسپل جناب شیخ نبی شیخ غنی کی زیر صدارت منعقد کیا گیا الحرا اسکول کے طالب علم کی تلاوت قرآن پاک سے اجلاس اول کا آغاز کیا گیا۔

پروگرام کا افتتاح محمدی ایجوکیشنل سوسائٹی بھساول کے صدر و الحرا اردو اسکول کے چیئرمین الحاج انصار احمد نے اپنے افتتاحی کلمات سے کیا انھوں نے درس و تدریس اور تعلیم جیسے موضوع پر تفصیلی اظہار خیال کیا انھوں نے کہا کہ استاد کو چاہیے کہ وہ اپنے مقدس پیشے کو مشن سمجھے اور اپنے پیشے کے ساتھ پورا انصاف کرے۔

مقالہ نگار محمد حسن فاروقی مقالہ بعنوان 'مہاراشٹر میں اردو میڈیم اسکول کی صورت حال' محمد اسحاق خضر، مقالہ بعنوان 'طریقۂ تدریس اور گرامر'، الطاف حسین مقالہ بعنوان 'غیر اردو داں حضرات میں اردو کا

فروغ، رحیم رضا مقالہ بعنوان 'طریقہ تدریس اردو نظم' ضیاء النبی مقالہ بعنوان 'طریقہ تدریس اردو نثر' نے اپنے مقالے پیش کیے۔

پروگرام کے سبھی مقالہ نگاروں کا استقبال میونسپل کونسل کے کونسلر اختر بھائی پنجاری نے کیا۔ سوسائٹی کے صدر و کنوینر الحاج تسکین احمد نے تعارفی کلمات و سوسائٹی کی روداد پیش کی اور مہمانوں کا تعارف کروایا، دوپہر دوسرے اجلاس میں مقالہ نگاروں سے سوال و جواب کا سلسلہ دلچسپ رہا۔ محمدی اینگلو اردو ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ابرار شیخ سلیم نے رسم شکریہ ادا کیا۔

دوسرے روز 21 فروری 2010 کو ساڑھے دس بجے الحرا اسکول کے طالب علم کی تلاوت قرآن پاک سے پروگرام کا آغاز ہوا، تسکین احمد نے آئے ہوئے اساتذہ و ماہرین تعلیم کا تعارف پیش کیا۔ آئے ہوئے اساتذہ و ماہرین تعلیم نے طلبہ و طالبات کو اردو نظم۔ نثر، گرامر اور خوشخطی جیسے عنوانات کے تحت معلومات فراہم کی۔

آخر میں تسکین احمد نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بھی تہہ دل سے شکریہ ادا کیا، اس توقع کے ساتھ کہ قومی کونسل کی معاونت شامل رہی تو انشا اللہ آئندہ بھی ایسے ہی کانفرنس اور ورکشاپ و سیمینار منعقد کیے جائیں گے۔

صدارتی خطاب میں محترم شیخ نبی پرنسپل بی زیڈ اسکول نے مقالہ نگاروں کی کوششوں کو سراہا اور ٹیچرس ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کی علمی اور ادبی خدمات کا خاص طور پر ذکر کیا اور ان کی کوششوں کو سراہتے ہوئے اس کانفرنس و ورکشاپ کے انعقاد پر قومی کونسل کا شکریہ ادا کیا۔

جناب اشرف خاں کے رسم شکریہ کے ساتھ دوسرے دن کے اجلاس کا اختتام ہوا دونوں دن کے پروگرام میں کثیر تعداد میں اساتذہ و طلبہ شریک تھے۔ (ڈاک سے)

عمیق حنفی: یادگار توسیعی خطبہ

● 6 مارچ، 2010 کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون اور شعبۂ اردو گورنمنٹ مادھو کالج، اجین (ایم پی) کے زیر اہتمام پرنسپل مادھو کالج، ڈاکٹر ایل این ورما کی زیر صدارت، ایک یادگار توسیعی خطبہ عمیق حنفی، کا انعقاد ہوا۔ اس میں مہمان مقرر ادیب و دانشور پروفیسر آفاق احمد (بھوپال) اور مہمان خاص شری شیو یندر تیواری (جن بھاگیداری ادھیکش) تھے۔

تیسری بار منعقد ہونے والے اس یادگار خطبے میں صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر غلام حسین نے مہمان مقالہ نگار کا تعارف کرایا۔ انھوں نے عمیق حنفی کی ادبی شخصیت اور توسیعی خطبے کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر آفاق احمد نے پر مغز مقالہ بعنوان 'تازہ آباد بستیوں کا اہل نظر شاعر (اقبال)' پیش کیا۔ انھوں نے کلام اقبال کی معنویت کو موجودہ زمانے کے تناظر میں مدلل انداز میں پیش کیا اور ساتھ ہی اقبال سے متعلق کچھ غلط فہمیوں کا ازالہ بھی بڑی خوش اسلوبی سے کیا۔ صدر اور مہمان خاص نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے لیے اظہار ممنونیت کی اور شعبۂ اردو کے اساتذہ و طلبہ کی حوصلہ افزائی کی۔ رسم شکریہ شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر ظفر محمود نے ادا کی۔ (ڈاک سے)

خواتین قلم کاروں نے ادبی مقام محنت سے حاصل کیا: جیلانی بانو

● نئی دہلی، 26 اپریل۔ خواتین قلم کار بھی کسی مرد نقاد پر بوجھ نہیں بنی ہیں بلکہ نقاد تو خود اپنے بوجھ میں دبے جا رہے ہیں۔ خواتین لکھنے والیوں نے اپنا بوجھ خود اپنے کاندھوں پر اٹھایا اور پورے حوصلے کے ساتھ اپنا ادبی سفر طے کیا اور کامیابی کی منزلیں طے کی ہیں۔ ان خیالات کا اظہار معروف فکشن نگار جیلانی بانو نے کیا۔ وہ اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام ''نسائی ادب'' پر منعقد سہ روزہ کل ہند سیمینار میں بطور مہمان خصوصی افتتاحی خطبہ پیش کر رہی تھیں۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت پروفیسر صادق نے اور نظامت صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی پروفیسر ارتضی کریم نے کی۔ جیلانی بانو نے بہت ہی خوبصورت انداز میں اپنی گفتگو کا آغاز کیا اور کہا کہ خواتین کے اس سیمینار میں خواتین کی شرکت بہت ہی کم ہے۔ ایسا کیوں ہے یہ بھی قابل غور بات ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو اکادمی نے نسائی ادب پر گفتگو کرنے کے لیے ملک بھر سے خواتین قلم کاروں کو مدعو کیا ہے جو خوش آئند ہے۔ قبل ازیں اکادمی کے وائس چیئرمین سید شریف الحسن نقوی نے آئے ہوئے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ آج پورے ہندوستان میں عورتوں کے سلسلہ میں ایک بحث چھڑی ہوئی ہے۔ عورتوں کے متعلق پارلیمنٹ سے لے کر ملی اداروں تک باتیں ہو رہی ہیں۔ سیمینار کے کنوینر پروفیسر عتیق اللہ نے موضوع کی تفصیلات بیان کی۔ پروگرام کے آخر میں سکریٹری اردو اکادمی دہلی مرغوب حیدر عابدی نے آئے ہوئے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس

موقعے پر پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر انیس اشفاق، جی آر کنول، ڈاکٹر نگار عظیم، شہباز ندیم ضیائی، جاوید اقبال، ڈاکٹر صالحہ زرین، رؤف رامش، ڈاکٹر مشتاق قادری، شعیب رضا فاطمی، ڈاکٹر احمد امتیاز، ڈاکٹر راشد عزیز اور ریسرچ اسکالر عالیہ، عارف اشتیاق، محمد ارشد، امان اللہ کے علاوہ کئی اہم لوگوں نے شرکت کی۔ (ہمارا سماج، دہلی)

نسائی ادب پر سیمینار کی رپورٹ

● نئی دہلی۔26 مارچ، پروفیسر انیس اشفاق کو آج خواتین قلمکاروں کی سخت کلامی کا اس وقت سامنا کرنا پڑا جب انھوں نے اپنا مقالہ 'فہمیدہ ریاض کی شاعری' پیش کیا اور ان کی نظموں کے محض وہ حصے پیش کیے جو صرف عورت کے خدو خال کو پیش کرنے والے تھے۔ نسائی ادب پر روشنی ڈالتے ہوئے فہمیدہ ریاض کی شاعری کے منفی پہلو کو پیش کیا اور کہا کہ یہ ہے 'نسائی ادب' جس پر ڈاکٹر نگار عظیم نے اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پہلے نسائیت اور تانیثیت کے معنی و مفہوم سمجھ لیجیے اس کے بعد اس پر گفتگو کریں تاکہ بے حیائی کے جملے ادا نہ ہوں۔ ڈاکٹر ثروت خان نے کہا کہ ادب میں فیصلے نہیں ہوا کرتے۔ اس لیے فیصلہ کرنے کی کوشش نہ کی جائے تو بہتر ہے۔ سیمینار کی نظامت کرتے ہوئے وسیم راشد نے بھی اپنا احتجاج درج کرایا ہے۔ یہی نہیں اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر عتیق اللہ نے کہا کہ سیمینار کا پوڈیم مسجد کا منبر نہیں ہوتا کہ آپ امام بن کر عصا دکھائیں بلکہ سیمینار کے پوڈیم پر مقالہ نگاروں کے ہاتھوں میں ٹارچ ہونی چاہیے۔

اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام نسائی ادب پر منعقدہ کل ہندسہ روزہ سیمینار کے افتتاحی دن کے پہلے اجلاس میں چھ مقالے پڑھے گئے۔ ڈاکٹر خالد علوی نے 'پاکستان میں خواتین کی شاعری' پر ڈاکٹر خالد نے 'پاکستان میں خواتین کی افسانہ نگاری' پر پروفیسر ابن کنول نے 'داستانوں میں عورت کے کردار' ڈاکٹر نگار عظیم نے 'اردو میں خواتین افسانہ نگار' پروفیسر قاضی جمال حسین نے 'عصمت چغتائی کا افسانوی فن' اور پروفیسر انیس اشفاق نے 'فہمیدہ ریاض کی شاعری' کے حوالے سے نسائی ادب پر اپنے مقالے پیش کیے۔ پروفیسر انیس اشفاق کے مقالے پر ڈاکٹر ثروت خان، ڈاکٹر نگار عظیم، ناظم اجلاس وسیم راشد اور قاضی جمال حسین نے سوالات کیے، جس کی خاطر خواہ وضاحت موصوف نے کی۔ بعد ازاں مجلسِ صدارت کے ایک رکن پروفیسر شمس الحق عثمانی نے مجموعی طور پر تمام مقالوں پر گفتگو کے دوران کہا کہ نسائی ادب پر گفتگو کرنا بہت آسان یقیناً نہیں ہے لیکن یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ اس سے پہلے ہمارے ادب میں ایک مقصد کو جب نعرہ بنایا گیا تھا تو ادب کا کیا حشر ہوا تھا۔ آج نسائی ادب یا فیمینزم پر جو رویہ اختیار کیا جا رہا ہے اگر پھر یہ مقصد نعرہ بن گیا تو ادب پر ادبار کے بادلوں کا چھا جانا حیرت کی بات نہیں ہوگی۔ موصوف نے اپنی گفتگو کے دوران کہا کہ اردو فکشن کے آبا و اجداد پریم چند، منٹو اور راجندر سنگھ بیدی جیسے فنکاروں نے اپنی تحریر کردہ تخلیقات میں نسوانی کرداروں کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا ہے اسے نظر انداز کر کے مجموعی تخلیقات پر بات کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ انھوں نے بیدی کے حوالے سے کہا کہ انھوں نے لکھا ہے کہ جب میں نسوانی کردار تحریر کرتا ہوں۔ تو خود عورت بننے کی کوشش کرتا ہوں وقت کی کمی کے باعث دیگر دو رکن مجلسِ صدارت پروفیسر ارتضیٰ کریم اور پروفیسر اعجاز علی ارشد نے صدارتی تقریر سے گریز کیا۔ اختتامی اجلاس میں صرف دو مقالہ نگاروں پروفیسر ارتضیٰ کریم نے 'پیغام آفاقی کے ناول 'مکان' کی خاتون کردار 'نیرا' کا تجزیاتی مطالعہ' اور ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے 1960 کے بعد خواتین ناول نگار کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر عتیق اللہ اور ڈاکٹر نگار عظیم نے کی۔ نظامت کے فرائض رئیس فاطمہ نے انجام دیے۔ پروگرام کے آخر میں سکریٹری اردو اکادمی نے آئے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

(ہمارا سماج، دہلی)

بچوں کے ادب میں ادب کا مستقبل

● نئی دہلی۔ پروفیسر ابن کنول نے 'بچوں کا ادب اور اردو' میں ادب اطفال کا محاکمہ کرتے ہوئے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا کہ بدلتی قدروں اور نئی ایجادات نے بچوں کے ادب کی تخلیق کو مشکل سے مشکل ترین بنا دیا ہے۔ موصوف نے دیسی تخلیق (Indegenous Creation) یعنی پنچ تنتر اور الف لیلیٰ کی جگہ ہیری پوٹر کے بڑھتے قدم پر تشویش ظاہر کی۔ پروفیسر توقیر احمد خاں نے علامہ اقبال کے شعری آثار میں موجودہ ادب اطفال کی نہ صرف نشاندہی کی بلکہ اقبال کی اردو نظموں کے ماخذ کا ذکر بھی کیا، لیکن اس حقیقت کی بھی نشاندہی کر دی کہ وہ لفظی تراجم نہیں بلکہ معنویت کا مظہر ہیں اور جا بجا اقبال کا تخلیقی عنصر مصدر سے بہت آگے نکل گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد کاظم نے بیسویں صدی کے

ادب اطفال میں بچوں کے ڈراما پر پرمغز تقریر کی۔ ڈاکٹر ابوبکر عباد نے اپنی تقریر میں تخلیقی عمل کا جائزہ لیتے ہوئے مختلف اندیشوں کی نشاندہی کی اور اس پر روشنی ڈالی کہ الیکٹرانک میڈیا کس طرح اس انحطاط کا باعث ہے۔ اس کے ساتھ ہی ادب اطفال سے متعلق جرائد و رسائل کی یکے بعد دیگرے بند ہوتی اشاعت پر تشویش ظاہر کی۔ اشفاق عارفی نے اپنے مقالے میں الیکٹرانک میڈیا کے منفی اور مثبت پہلوؤں پر جامع روشنی ڈالی۔ اسد رضا نے بچوں کی مزاحیہ کہانی 'میٹھا امتحان' پیش کی۔ سیمینار کے پہلے مقالہ نگار ڈاکٹر سید سجاد مہدی حسینی نے اپنے مقالے میں ادب اطفال سے متعلق موجودہ سبھی اصناف کا جائزہ لیا۔ آخر میں صدر شعبۂ اردو پروفیسر ارتضیٰ کریم نے مندوبین و شرکا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے موجود طلبہ و طالبات و دیگر کو اس طرف متوجہ کیا کہ ذہن کی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا دیجیے اور ابھی سے عہد مصمم کرتے ہوئے قلم لے کر بیٹھ جائیے اور کچھ لکھیے۔ اس کے بعد اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا کہ لا تدرک العلم براحۃ الجسم یعنی جسم کو آرام میں رکھ کر علم حاصل کرنا تو دور درک بھی نہیں کر سکتے۔ انھوں نے کہا کہ بچوں کے ادب کے مستقبل میں ادب کا مستقبل پوشیدہ ہے۔ اس اجلاس کی صدارت ڈاکٹر فاروق بخشی اور پروفیسر توقیر احمد خاں نے کی اور نظامت کے فرائض جناب ڈاکٹر سید سجاد مہدی حسینی نے انجام دیے۔ پروفیسر فاروق بخشی، صدر شعبۂ اردو کوٹہ راجستھان نے صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے اس بات پر اصرار کیا کہ طالب علم سے لے کر دانشوروں اور بڑے تخلیق کاروں کو ادب اطفال کی تخلیق میں آگے آنا چاہیے ساتھ ہی انھیں اپنے اندر کے بچے کو زندہ رکھنا ہوگا۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

فارسی اور عربی مخطوطات مشترکہ تہذیب کا سرمایہ

● نئی دہلی۔ 29 مارچ، فارسی اور عربی مخطوطات نہ صرف ملک کا عظیم ثقافتی سرمایہ ہیں بلکہ ایک مشترکہ تہذیب کا ناقابل تردید ثبوت بھی ہیں۔ اس لیے ان کا تحفظ ایک قومی فریضہ ہے اور اس کے لیے حکومت کے ساتھ عوام کو بھی اپنی ذمے داریاں ادا کرنی ہوں گی۔ ان خیالات کا اظہار آج یہاں ماہرین مخطوطات، علما، دانشور، لائبریریوں اور میوزیم سے وابستہ ماہرین نے قومی مخطوطات مشن کے زیر اہتمام منعقدہ کانفرنس میں کیا۔ اس تین روزہ کانفرنس میں ملک بھر سے ماہرین شرکت کر رہے ہیں۔ ماہرین نے ملک بھر میں تمام زبانوں اور بالخصوص فارسی اور عربی مخطوطات کے تحفظ کی صورتحال پر تشویش کا اظہار کیا اور اس بات پر زور دیا کہ مخطوطات کو محفوظ کرنے کے لیے جنگی پیانے پر کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ کانفرنس کی صدارت عربی و فارسی مخطوطات کے ماہر اور سینٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن میں طبی مخطوطات کے مشیر پروفیسر احمد اشفاق نے کی۔ پروفیسر چندر شیکھر نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ افتتاحی تقریب سے خطاب کرنے والوں میں سابق سفیر اور اندرا گاندھی نیشنل سینٹر فار آرٹس کے صدر چنمے آرگریکھان، وزارت کلچر میں جوائنٹ سکریٹری ڈاکٹر کمار، جمہوریہ ایران کے کلچرل قونصلر ڈاکٹر کریم نجفی اور قومی مخطوطات مشن کی ڈائرکٹر پروفیسر دیپتی ترپاٹھی شامل ہیں۔ مقررین نے کہا کہ حالانکہ قومی مخطوطات مشن نے اپنے قیام کے بعد سے پچھلے سات برسوں کے دوران مخطوطات کے حصول، ان کی زمرہ بندی، ان کی حفاظت اور ان کی اشاعت کے لیے قابل تعریف اقدامات کیے ہیں۔ پروفیسر احمد اشفاق نے عربی اور فارسی مخطوطات کی اہمیت اور افادیت پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ دیپتی ترپاٹھی نے کہا کہ ہندوستان کی تاریخ فارسی زبان کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ انھوں نے کہا کہ مخطوطات کو منظر عام پر لانے سے ملک میں پائی جانے والی بہت ساری غلط فہمیوں کو دور کرنے میں مدد ملے گی۔ انھوں نے کہا کہ قومی مخطوطات مشن عربی اور فارسی کے مخطوطات کی اشاعت میں ہر ممکن مدد دے گا۔ خیال رہے کہ اس تین روزہ کانفرنس میں فارسی اور عربی مخطوطات کی تاریخ، فارسی اور عربی مخطوطات میں سماجی پہلو، تاریخی پہلو اور ادبی پہلو، مشترکہ ثقافت کے فروغ، نیز ان مخطوطات میں طبی و سائنسی پہلوؤں کے علاوہ ان کے تحفظ وغیرہ پر تفصیلی تبادلۂ خیال کیا جائے گا، جن میں پروفیسر عبدالحق، ڈاکٹر ستیہ ورت ترپاٹھی، پروفیسر الطاف احمد اعظمی، مسٹر احمد علی، پروفیسر مہ جبیں اختر، پروفیسر ابن کنول، پروفیسر شریف حسین قاسمی، ڈاکٹر زرینہ پروین، پروفیسر ریحانہ خاتون، ڈاکٹر سید اختر حسین، ڈاکٹر نسیم اختر، پروفیسر این۔ خان، ڈاکٹر محمد خالد صدیقی، ڈاکٹر ایم۔ اے اصلاحی، پروفیسر اے قیو جعفری، پروفیسر آذرمی دخت صفوی، ڈاکٹر قمر اقبال، ڈاکٹر منصورہ حیدر، ڈاکٹر شمیم احمد، ڈاکٹر طارق سعید وغیرہ اظہار خیال فرمائیں گے۔ (ہندوستان ایکسپریس)

دیال سنگھ کالج میں ہم عصر طنزیہ و مزاحیہ ادب پر مذاکرہ

● اردو سوسائٹی دیال سنگھ کالج، نئی دہلی کی جانب سے ہم عصر طنزیہ

مزاحیہ ادب پر یک روزہ مذاکرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کی۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر اندر جیت سنگھ بخشی نے استقبالیہ خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے کالج میں اردو شعبے کی ترقی کے لیے ہر ممکن تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ بعد ازاں مشہور و معروف طنز و مزاح نگار اسد رضا نے 'انٹرویو کرانی مہارانی کا'، نصرت ظہیر نے 'چینی، مصری اور شکر اور عظیم اختر نے 'پھپھی' کیسے کہہ سکتا ہوں، جیسے طنزیہ و مزاحیہ نگارشات پیش کیے، شعبے کے طلبہ و طالبات نے طنز و مزاح نگاروں سے فرداً فرداً سوالات کیے جن کے تشفی بخش جوابات فنکاروں نے دیے۔ صدر شعبہ ڈاکٹر مولیٰ بخش نے تینوں طنزیہ و مزاحیہ تخلیقات کے تجزیہ کے دوران کہا کہ اسد رضا نے کردار خلق کرنے میں مہارت دکھائی ہے۔ داستانوں کے عہد سے لے کر تا حال یعنی مشتاق احمد یوسفی تک کوئی نہ کوئی کردار مرکز مزاح بنتا آ رہا ہے۔ اسد رضا کے یہاں نمائش خاں یہی کام انجام دیتا ہے۔ انھوں نے نصرت ظہیر کی تازہ تخلیق 'چینی، مصری اور شکر' کو زبان یعنی لسانی بازیگری سے مزاح پیدا کرنے والی تحریر قرار دیا اور کہا کہ نصرت ظہیر کو معلوم ہے کہ نکتہ سنجی اور بذلہ سنجی (Wit) نیز فقرے بازی کے ذریعے کیسے مزاح پیدا کیا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ نصرت ظہیر نے اردو طنز و مزاح میں سیاسی ناہمواریوں اور موجودہ سیاسی صورت حال کو کچھ اس انداز سے چھیڑا ہے کہ طنز کی ٹیس اور مزاح کے فوارے شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔ عظیم اختر کے مزاحیہ مضمون 'پھپھی' کیسے کہہ سکتا ہوں' پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ عظیم اختر در اصل طنز نگار ہیں۔ انھوں نے کالج کے ماحول میں نئی نسل کی گفتگو میں کس کس طرح کی ناہمواریاں پائی جاتی ہیں، پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے ادبی گھوٹالوں کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔

صدارتی تقریر کے دوران پروفیسر ارتضیٰ کریم نے ڈاکٹر مولیٰ بخش کے اس اقدام کو سراہا کہ انھوں نے عموماً نظر انداز کیے جانے والی صنف پر توجہ دی۔ پروفیسر کریم نے کہا کہ طنز و مزاح تو پورے ادب کا سرمایہ ہے۔ ہمیں فخر ہے کہ ہمارے عہد میں جہاں مجتبیٰ حسین ایک Icon بن چکے ہیں تو دوسری طرف یہ روایت اسد رضا، نصرت ظہیر اور عظیم اختر کے ذریعے خوبصورتی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج اردو کی ضرورت ناگزیر ہے۔ اردو کے بغیر ہندوستان آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اردو زبان ایسی ہے جو دل سے نکل کر دل تک پہنچتی ہے۔ آخر میں ڈاکٹر مولیٰ بخش نے مذاکرے میں آئے تمام مہمانوں اور مندوبین کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔

اس پروگرام میں شعبۂ اردو، دیال سنگھ کالج اور دیگر شعبے کے طلبہ و طالبات اور اساتذہ کے علاوہ دہلی کی تینوں جامعات کے طلبہ بھی موجود تھے۔

(ڈاک سے)

احرار ہندی کے اعزاز میں استقبالیہ تقریب

● نئی دہلی۔8 اپریل، غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ایران کے معروف خطاط رسول مرادی اور مشہور ہندوستانی خطاط احرار ہندی کے اعزاز میں ایک استقبالیہ تقریب کا انعقاد کیا گیا پروگرام کا افتتاح جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحسن نے کیا بحیثیت مہمان خصوصی کلچرل کونسل ایران کلچرل ہاؤس کریم نجفی نے شرکت کی۔ پروگرام کے آغاز پر پروفیسر صدیق الرحمٰن، پروفیسر مشیر الحسن اور کریم نجفی کو پھولوں کا گلدستہ دے کر استقبال کیا، شاہد ماہلی نے محمد احرار ہندی اور رسول مرادی کا استقبال پھولوں کے گلدستوں سے کیا پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنے افتتاحی خطبے میں کہا کہ فن اپنی جگہ پر ایک فن ہے لہذا شاعری، پروٹنگ خطاطی انسانی دخل کے بغیر بے روح ہے انھوں نے کہا کہ فن ایک ایسا آرٹ ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے اور ہمارے خطاط اس کی نہ صرف حفاظت کر رہے ہیں بلکہ اسے فروغ دے رہے ہیں، غالب انسٹی ٹیوٹ کا مقصد ادب کی ان تمام جہتوں کو سمیٹنا ہے جو ملک اور ملک کے باہر نشو و نما پا رہے ہیں مسٹر قدوائی نے امید ظاہر کی کہ انسٹی ٹیوٹ میں آئندہ بھی اسی طرح کی محفلیں منعقد ہوتی رہیں گی۔ ہندی خطاط احرار ہندی نے اپنے مقالے میں کہا کہ جب تک خدا کا کلام زندہ ہے اس وقت تک خطاطی زندہ رہے گی، کیونکہ اللہ کے کلام کا حسن ماند نہیں پڑ سکتا ہے پروفیسر مشیر الحسن نے خطاط کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ مجھے امید بلکہ کامل یقین ہے کہ خطاطی میں دن بہ دن ارتقا و ترویج ہوتی رہے گی۔ اس موقعے پر فرمان کرمانی نژاد نے بھی خطاطی پر ایک پر مغز مقالہ پیش کیا پروگرام کی نظامت رضا حیدر نے کی پروگرام کا اختتام شاہد ماہلی کے شکریے کے ساتھ ہوا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر اے رحمان ایڈوکیٹ کے علاوہ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی سرکردہ شخصیات موجود رہیں۔

(ہمارا سماج، دہلی)

مختصرات:

اقلیتوں کو 30 لاکھ اسکالرشپ دی گئی: سلمان خورشید

● دبئی۔ مرکزی وزیر برائے اقلیتی امور سلمان خورشید نے کہا ہے کہ اقلیتی کمیونٹی کی پریشانیوں کو دور کرنے کے لیے مرکزی سرکار نے اس کمیونٹی سے وابستہ طلبہ کو 30 لاکھ اسکالرشپ دی ہے۔

متحدہ عرب امارات میں مختلف اقلیتی گروپوں کے نمائندوں کے ساتھ مل کر ایک ملاقات میں سلمان خورشید نے کہا کہ یہ قدم سچر کمیٹی کی سفارشات کی بنیاد پر اٹھایا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ملک بھر سے منتخب کیے گئے 90 ضلعوں میں سے 67 مسلم اکثریتی اضلاع ہیں اور ان کی ترقی کے لیے 3700 کروڑ روپے منظور کیے گئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ایم فل اور پی ایچ ڈی کے طلبہ کو 650 فیلوشپ دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ملک بھر کے 70 ایسے تعلیمی ادارے منتخب کیے گئے ہیں جن میں اقلیتی کمیونٹی کے طلبہ کی فیس معاف کر دی گئی ہے۔ اس میں آئی آئی ٹی اور آئی آئی ایم بھی شامل ہے۔ (ہمارا سماج، نئی دہلی)

بچوں کے ادب پر سیمینار

● دہلی یونیورسٹی میں دو روزہ قومی سیمینار میں اردو میں بچوں کا ادب کے عنوان سے خطاب کرتے ہوئے اقلیتی کمیشن کے چیئرمین مسٹر کمال فاروقی نے کہا کہ گزشتہ بیس سالوں میں بچوں کے ادب میں جو کمی واقع ہوئی ہے وہ کافی تشویش ناک ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو ادب میں بچوں کے لیے صرف امنگ اور پیام تعلیم قابل ذکر رسالے ہیں لیکن ان کی اشاعت میں کمی ایک فکر کی بات ہے۔ انھوں نے کہا کہ پہلے بچوں اور بڑوں کے ادبا علاحدہ نہیں ہوتے تھے، لیکن اب اس پہلو کو ادبا نظر انداز کرتے جا رہے ہیں۔ واضح رہے کہ پروگرام کا افتتاح چندر بھان خیال نے کیا جبکہ صدارت کمال فاروقی اور کلیدی خطبہ ارتضیٰ کریم، نظامت ڈاکٹر راشد الحق اور اظہار تشکر ڈاکٹر توقیر احمد نے کیا۔ بعد ازاں دوسرے سیشن کی صدارت ڈاکٹر کوثر مظہری اور نظامت قمر الحسن نے کی۔ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، مولیٰ بخش وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ (ہمارا سماج، نئی دہلی)

جامعہ ملیہ میں سنسکرت کی تعلیم

● نئی دہلی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں آئندہ سیشن 11-2010 سے طلبہ سنسکرت کی تعلیم حاصل کر سکیں گے۔ جامعہ میں ایسا پہلی بار ہوگا جب بی اے کے طلبہ کو پڑھنے کے لیے زبان کے متبادل کی صورت میں سنسکرت کے انتخاب کا موقع ملے گا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں جہاں اردو ہندی، فارسی، فرانسیسی سمیت مختلف غیر ملکی زبانوں کے متبادل ہیں وہیں سنسکرت کو متبادل کی شکل میں پیش کرنا اپنے آپ میں تاریخی قدم ہے۔ جامعہ کی میڈیا کوآرڈی نیٹر سیما ملہوترا کے مطابق اس سیشن سے جامعہ میں بی.اے کے کورسوں میں داخلہ کے خواہش مند طلبہ کو زبان کی شکل میں سنسکرت کا متبادل فراہم کرایا جا رہا ہے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

ادب سرحدوں کا قائل نہیں

● نئی دہلی، 31 مارچ، دہلی میں پاکستانی ادیبوں کی آمد پر جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں استقبالیہ پروگرام کا انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت ڈاکٹر آصف زہری نے کی اور نظامت کے فرائض یونیورسٹی کے جواں سال اسکالر محمد آصف آعظمی نے کی۔ پاکستانی ادیبوں کے اس وفد میں طاہرہ اقبال، حمیرا راحت، طاہر اقبال، فرحانہ فرحان اور عاصم بٹ شامل تھے۔ صدارتی خطاب میں ڈاکٹر آصف زہری نے کہا کہ ہمارے مہمان نہیں بلکہ ایک ہی گھر کے فرد ہیں جن سے کافی وقفے کے بعد ملاقات ہو رہی ہے۔ انھوں نے اس موقعے پر جے این یو کی ادبی روایت اور یہاں کی تعلیمی و ادبی سرگرمیوں کا بھی ذکر کیا۔ ڈاکٹر آصف زہری نے کہا کہ ادب سرحدوں کا قائل نہیں، لکھے ہوئے حرف، دانش کا اشاریہ ہوتے ہیں جو کسی سرحد کے پابند نہیں ہوتے۔ ہم ایک دوسرے کو پڑھتے اور سنتے وقت علاقے یا ملک کا خیال نہیں کرتے۔ سب سے پہلے طاہر اقبال نے عالمی امن و آشتی پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ عالمی امن کا تصور ادب کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا ان دنوں جن مسائل کی آماجگاہ بنی ہے اس کے لیے ادیبوں کو نہ صرف آگے ہونا ہوگا بلکہ ان کی یہ بھی ذمے داری ہے کہ وہ ادب کے توسط سے تلاش امن کے لیے کوشاں ہوں۔ اس موقعے پر طاہرہ اقبال نے اپنا افسانہ پڑھا، جسے حاضرین نے بے حد پسند کیا۔ حمیرا راحت کی غزلیں اور نظمیں بہت ذوق وشوق کے ساتھ سنی گئیں۔ جے این یو طلبہ اور اسکالرز کی طرف سے نمائندگی یہاں کے متعدد طلبہ نے کی۔ ڈاکٹر پرویز احمد اعظمی نے طنزیہ شاعری پیش کی۔ ڈاکٹر زاہد الحق، ڈاکٹر ہادی سرمدی ایاز اعظمی اور سالم نے اپنی تخلیقات پیش کی۔

(ہمارا سماج، نئی دہلی)

شکوہ وشکایات:

جھارکھنڈ میں اردو کے خلاف سازش: بندھوتر کی

● مانڈر۔ جھارکھنڈ کا کوئی ملی رہنما اردو کی جنگ اس طرح نہیں لڑ رہا ہے جس طرح سابق وزیرتعلیم بندھوتر کی لڑ رہے ہیں۔ اردو کے لیے ان کی لڑائی نہ صرف سڑکوں پر ہے بلکہ بندھوتر کی ایوان میں بھی اردو کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ ریاست کے سابق وزیرتعلیم بندھوتر کی نے برجستہ کہا کہ اردو زبان کو ختم کرنے کی منصوبہ بند سازش چل رہی ہے۔ ایوان سے باہر نکلنے کے بعد روزنامہ راشٹریہ سہارا سے خصوصی گفتگو میں انھوں نے کہا کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ لیکن مدرسوں اور اردو اسکولوں میں نہ تو اردو کی کتابیں دستیاب ہیں اور نہ ہی انھیں اردو میں سوالنامے دیے جارہے ہیں۔ ہندی میڈیم کے اسکولوں میں سوال نامے مہیا کرادیے گئے ہیں۔ اردو کے سلسلے میں ایک ہی سوال نامہ سی آرسی میں بھیجا گیا۔ جبکہ ایک سی آرسی میں کئی اسکول ہوتے ہیں۔ واضح رہے کہ اردو میں سوال نامہ نہ ہونے کی وجہ سے اردو طلبہ کو دوسرے دن امتحان دینا پڑا تھا۔ انھوں نے کہا کہ آئی اے ایس کے امتحان میں اردو زبان کے طلبہ کو اردو میں امتحان دینے کی اجازت ہے، جے پی ایس سی میں اس کی اجازت نہیں ہے جو اردو والوں کے ساتھ کھلی ناانصافی ہے۔ جے پی ایس سی کے ضابطہ کے تحت صرف انگریزی اور ہندی میں ہی جواب دینا لازمی ہے۔ بندھوتر کی نے کہا کہ سرکاری مدارس سے فارغ التحصیل عالم کو اگرچہ گریجویٹ کا درجہ حاصل ہے، لیکن یہ گریجویٹ جھارکھنڈ پبلک سروس کمیشن کا امتحان نہیں دے سکتے، جبکہ حکومت مدرسہ کے عالموں کو گریجویٹ کا درجہ دیتی ہے تو پھر انھیں جے پی ایس سی امتحان دینے سے کیوں محروم کیا جارہا ہے؟ انھوں نے کہا کہ شرمناک بات تو یہ ہے کہ ریاستی حکومت اردو کی تعلیم اور اردو زبان والوں کو نوکری سے محروم کرنے کے لیے دو رخی پالیسی اپنا رہی ہے۔ ریاست میں اردو کو سرکاری درجہ حاصل ہے، لیکن کسی بھی تھانے یا دفتر میں کوئی اردو ٹرانسلیٹر یا مترجم نہیں ہے۔ 582 مدرسوں میں کسی کو بھی گرانٹ نہیں ملا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جھارکھنڈ میں اردو کی لڑائی سب کو مل جل کر لڑنی ہوگی تبھی یہ زبان یہاں پر محفوظ رہ سکتی ہے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو اسکولوں کے 15 ہزار بچے کتابوں سے محروم

● ہزاری باغ، جھارکھنڈ ریاست کی تشکیل کے بعد جس طرح سے ریاست کے مسلمانوں کو پریشان کیا جارہا ہے وہ سب کے سامنے عیاں ہے۔ یہاں تک کہ حکومت مسلم بچوں کی تعلیم پر بھی اپنی سیاست اور تنگ نظری سے کام کررہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریاست کے مسلم بچے تعلیم کے میدان میں پیچھے ہورہے رہیں۔ ہزاری باغ ضلع کے اردو مڈل اسکول میں حکومت کی جانب سے مفت کتابیں تقسیم کرنے کے جھوٹے دعووں کا سنسنی خیز معاملہ سامنے آیا ہے۔ اردو اسکولوں میں کتابیں تقسیم کرنے کی غرض سے ایک اشتہار اخباروں میں شائع ہوا تھا جس میں واضح کیا گیا تھا کہ کن کن اسکولوں میں کتنی کتابیں تقسیم کی جائیں گی۔ المیہ یہ ہے کہ ضلع کے کئی ایسے اردو مڈل اور پرائمری اسکول ہیں جن میں کتابیں تقسیم نہیں ہوسکتیں۔ انجمن ترقی اردو کے سکریٹری ڈاکٹر جمال احمد نے بتایا کہ ضلع میں 56 پرائمری اور مڈل اسکول ہیں۔ ان میں صرف کٹکم سانڈی بلاک میں 9 اردو مڈل اسکول ہیں۔ ان میں صرف 7 ویں کلاس کے بچے کو 31 اور 8 ویں کلاس کے بچے کو 29 کتابیں ہی دی جا رہی ہیں۔ تعجب تو اس بات پر ہے کہ اچاک بلاک میں 4 مڈل اسکول ہیں جن میں ساتویں کلاس کے لیے بچے کے درمیان 44 کتابیں تقسیم کی جارہی ہیں جبکہ 8 ویں کلاس کے بچوں کو کتابیں تقسیم نہیں کی جارہی ہیں۔ حکومت کا ماننا ہے کہ اس کلاس میں ایک بھی بچہ اردو نہیں پڑھتا ہے۔ ضلع بھر میں جو اعداد وشمار کتابوں کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ اس میں کلاس ایک کے لیے 8091، کلاس 2 کے لیے 6163، کلاس 3 کے لیے 5655، کلاس 4 کے لیے 5235، کلاس 5 کے لیے 5140، کلاس 6 کے لیے 3510، کلاس 7 کے لیے 3001 اور کلاس 8 کے لیے 2517 یعنی کل 39312 بچوں کی تعداد دکھائی گئی ہے۔ انجمن ترقی اردو کے سکریٹری ڈاکٹر جمال احمد نے واضح کیا کہ اردو جاننے والوں کی صحیح تعداد تقریباً 65 ہزار ہے جبکہ خود محکمہ تعلیم نے جو سالانہ امتحان میں سوال نامے کے آرڈر دیے اس میں اردو زبان جاننے والے بچوں کی تعداد 55976 دکھائی گئی ہے۔ تعجب تو اس بات پر ہے کہ سوال نامہ اور کتابوں کی تقسیم میں اعداد وشمار کا گراف اچانک کیسے کم ہوگیا۔ سکریٹری ڈاکٹر جمال احمد نے پوچھا ہے کہ مسلم بچوں کے مستقبل سے کھیلنے اور غلط اعداد وشمار کا گراف اچانک کیسے کم ہوگیا۔ سکریٹری ڈاکٹر جمال احمد نے

مسلم بچوں کے مستقبل سے کھیلنے اور غلط اعداد و شمار پیش کر کے کتابیں تقسیم کرنے پر اپنی سخت برہمی کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے وزیر تعلیم ہیم لال مرمو اور وزیر فلاح و اقلیتی امور حاجی حسین انصاری کو ایک شکایت نامہ فیکس کیا اور اس کے لیے غیر جانبدارانہ طور سے جانچ کا مطالبہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اجاک اردو اسکول کے کلاس 8 ویں میں بچوں کی تعداد صفر دکھائی گئی ہے جبکہ کسٹم سانڈی بلاک اسکول میں 600 بچوں کی جگہ محض 29 بچوں کو دکھایا گیا ہے۔ انھوں نے واضح کیا ہے کہ ضلع بھر کے اردو اسکولوں میں کتابوں کی تقسیم پر تعجب کا اظہار کیا جا رہا ہے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

رامپور ریڈیو اسٹیشن کا اردو شعبہ لاوارث

● رامپور۔2 اپریل۔ رامپور شہر میں اقلیتوں کی کثیر تعداد ہے جہاں اردو بولنے والے موجود ہیں۔ اردو زبان یہاں کے خون میں رچی بسی ہے لیکن اس کے باوجود رامپور آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن کے اردو شعبہ کو بالکل لاوارث بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ گزشتہ کئی برسوں سے اردو سیکشن میں پیکس کی تقرری نہیں ہوئی ہے۔ رامپور اردو کا تیسرا اسکول اور علم و ادب کا گہوارہ ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات نے رامپور کی جانب سے اپنا منہ موڑ لیا ہے۔ اب تک اردو پروگرام کی ذمے داری سکھ رام سنگھ نبھا رہے تھے لیکن اب وہ بھی تبادلے کے بعد نجیب آباد جا چکے ہیں۔ یہاں کے ادبی حلقے میں یہ فکر لاحق ہو گئی ہے کہ آخر کانگریس کی مرکزی حکومت اردو زبان کے ساتھ یہ سلوک کیوں کر رہی ہے۔ کیا 22 کروڑ کی آبادی میں اطلاعات و نشریات کے وزیر کو اردو کا ایک بھی پیکس دستیاب نہیں؟ رامپور کے ادبی حلقے امید کرتے ہیں کہ رامپور ریڈیو اسٹیشن پر اردو داں اور اہل شخص کا تقرر جلد ہو سکے گا تاکہ معیاری پروگرام کا آغاز ہو۔

(صحافت، دہلی)

اردو خبروں کی کلپنگ ہونی چاہیے

● نئی دہلی، 25 مارچ۔ برسر اقتدار پارٹی کے ممبر اسمبلی چودھری متین احمد نے آج ڈی آئی پی سے مطالبہ کیا ہے کہ جس طرح انگریزی اور ہندی اخباروں کی خبروں کی کلپنگ تیار کرائی جاتی ہے اسی طرز پر اردو اخباروں کی بھی کلپنگ تیار کرائی جائے۔ چودھری متین احمد نے ضابطہ 280 کے تحت یہ معاملہ اٹھاتے ہوئے کہا کہ دہلی میں رہنے والی اقلیتوں کے مسائل جس طرح اردو کے اخباروں میں اٹھائے جاتے ہیں۔ اس سے حکومت آگاہ نہیں ہو پاتی ہے کیونکہ ان اردو اخباروں کی خبروں کی کلپنگ ہندی اور انگریزی اخباروں کی طرز پر نہیں ہوتی۔ مزید برآں اردو اخباروں میں سرکاری خبروں کو بھی مناسب جگہ دی جاتی ہے۔ انھوں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ دہلی میں اردو دوسری سرکاری زبان ہونے کے باوجود اردو اخباروں کو پچھلے کئی برسوں سے نظر انداز کیا جا رہا ہے چودھری متین نے اسمبلی اسپیکر سے مطالبہ کیا ہے کہ اردو اخباروں کی خبروں کی بھی کلپنگ تیار کرائی جائے وہیں انھوں نے ہاؤس سے مطالبہ کیا کہ دہلی کے تقریباً تمام محکموں میں اردو ٹرانسلیٹر کے عہدے پچھلے کئی سالوں سے خالی پڑے ہیں جس کی وجہ سے اقلیتوں کے مسائل سے حکومت پورے طور پر آگاہ نہیں ہو پاتی اس لیے اس سلسلے میں انتظامات کرتے ہوئے تمام محکموں میں اردو ٹرانسلیٹر کے عہدوں کو فی الفور پر کیا جانا چاہیے۔

(صحافت، دہلی)

اردو کی زبوں حالی کے ذمے دار

● ارریا۔ ہماری مادری زبان اردو ہے مگر ہم نے خود ہی اردو کی طرف توجہ دینا چھوڑ دیا ہے۔ حکومت بہار نے اردو کو دوسری سرکاری زبان بنا تو دیا مگر یہ صرف خانہ پری ہو کر رہ گئی۔ انجمن ترقی اردو و دیگر تنظیمیں ناکارہ ہو کر رہ گئی ہیں اور اردو کے فروغ کے لیے کوئی کام نہیں ہو رہا ہے۔ مذکورہ باتیں آل بہار مسلم کانفرنس کے صدر الحاج رضی احمد نے صحافیوں کو دیے گئے ایک بیان میں کہی۔ انھوں نے کہا کہ آج بڑے بڑے جلسے منعقد کیے جا رہے ہیں، علمائے دین اصلاح معاشرہ و دیگر سنجیدہ مسئلوں پر لمبی تقریریں کرتے ہیں مگر کبھی بھی کسی بھی جلسے و کانفرنس میں اردو کا کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ کسی بھی قوم کی مادری زبان جب دب جاتی ہے تو وہ قوم پسماندگی کی شکار ہو جاتی ہے۔ رضی احمد نے کہا کہ سبھی سیاسی رہنما اردو کو چھوڑ کر دوسری زبان میں تقریر کرنا اپنی شان سمجھتے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیا ہماری مادری زبان کے فروغ کے بجائے اسے دبانے کی کوشش کی جا رہی ہے؟ ملک کی گنگا جمنی تہذیب میں اردو کا ایک مقام رہا ہے مگر رفتہ رفتہ اس پر دوسری زبانوں کا غلبہ ہونے لگا۔ انھوں نے کہا کہ اگر یہی حال رہا تو اردو داں طبقے آنے والے دنوں میں اردو کو تاریخ کے اوراق میں تلاش کریں گے۔

آل بہار مسلم کانفرنس کے صدر الحاج رضی احمد نے مزید کہا کہ ضلع کے کئی کالجوں میں طلبہ اردو کی پڑھائی کر رہے ہیں مگر حیرت کی بات یہ

ہے کہ ان کالجوں میں یونیورسٹی کی جانب سے کوئی نصاب (Syllabus) دستیاب نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے طلبہ سخت پریشانی میں ہیں۔ حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ بی این منڈل یونیورسٹی بھی کالجوں میں نصاب مہیا کرائے تاکہ طلبہ کو اپنے کورس مکمل کرنے میں سہولت ہو۔ اس کی وجہ سے طلبہ اپنا کورس مکمل نہیں کر پاتے یہی حال کتابوں کا ہے۔ طلبہ کو اردو کی کتاب بھی دستیاب نہیں ہیں۔

واضح ہو کہ یہ مسئلہ صرف کالجوں تک محدود نہیں ہے بلکہ پرائمری اور ہائی اسکول کے طلبہ و طالبات کو اردو کی کتابیں حاصل کرنے میں پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ اساتذہ بھی اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دے رہے ہیں۔ اردو کے نام پر سائنس اور جغرافیہ کے ٹیچر بحال کیے جا رہے ہیں۔ ان حالات میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اردو کو ختم کرنے کی سازش رچی جا رہی ہے اگر ہم اب بھی نہ جاگے تو ہماری مادری زبان کا اللہ ہی حافظ ہے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اپنے ہی گھر میں تفریق کا شکار ہے اردو

● سرینگر، 26 مارچ۔ ریاست جموں و کشمیر سے شائع ہونے والے جملہ اخبارات اور جریدوں میں اردو زبان سرفہرست ہے لیکن سرکاری زبان ہونے کے باوجود اس کی اہمیت اور افادیت کو ایک گہری سازش کے تحت ختم کیا جا رہا ہے جبکہ سرکاری سطح پر اردو اخبارات کو اشتہارات کی قیمتوں میں سوتیلے پن کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ صحافت کے پاس دستیاب اعداد و شمار کے مطابق ریاست جموں و کشمیر میں 442 روزنامہ، ہفتہ روزہ اور ماہانہ اخبارات اور جریدے مسلسل شائع ہوتے ہیں جن میں اردو، انگریزی، ہندی، کشمیری اور ڈوگری زبانیں استعمال میں لائی جاتی ہیں۔ ان میں 300 کے قریب اخبارات اردو زبان میں ہی شائع ہوتے ہیں جبکہ انگریزی دوسرے نمبر پر ہے مگر اردو کے برعکس انگریزی زبان کو سرکاری سطح پر نہ صرف امتیازی حیثیت دی جاتی ہے بلکہ محکمۂ اطلاعات کے ذریعے اشتہارات کے ریٹ بھی ان اخبارات کو ہی زیادہ دی جاتی ہے۔ ریاست کی سرکاری زبان اردو ہے، اخبارات کی بڑی تعداد اردو میں شائع ہوتی ہے، اخبار بینوں کی تعداد زیادہ اردو پر ہی دسترس رکھتی ہے۔ اتنا ہی نہیں انگریزی اخبارات پڑھنے والے بھی ساتھ میں اردو اخبارات پڑھنے کا ذوق رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ریاست کی اکثریت دینی علم حاصل کرنے کے لیے بھی اردو زبان کا ہی انتخاب کرتے ہیں اور اسی زبان سے قرآن و حدیث کی روشنی بھی حاصل کرتے ہیں لیکن پھر بھی اس زبان کو ایک گہری سازش کے تحت زوال زدہ کرنے کی سازش سرکاری سطح پر ہی کی جاتی رہی ہے۔ ریاست خاص کر وادیٔ کشمیر کے صحافی پچھلی دو دہائیوں سے تلوار کی دھار پر چل کر حقائق کو اجاگر کر رہے ہیں جس میں 95 فیصد رول اردو اخبارات کا ہے۔ اتنا ہی نہیں نامساعد حالات کی مار جھیل رہے، اردو اخبارات کے مالکان بنکوں اور نجی قرضوں تلے دب کر رہ گئے ہیں لیکن پھر بھی اس مشعل کو روشن رکھتے ہوئے یہ اپنی منزل کی طرف گامزن ہیں تاکہ ان کے ساتھ ہو رہے مظالم کو روکا جا سکے۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو وہ وقت دور نہیں جب ریاستی سطح پر اردو کے جاننے والے سڑکوں پر آکر اپنا حق حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ (صحافت، دہلی)

اعزاز و اکرام:

پروفیسر صغریٰ مہدی کو 'میکش ایوارڈ'

● آگرہ۔ اردو زبان و ادب کی ترقی میں خواتین نے نہایت اہم رول ادا کیا ہے اور پروفیسر صغریٰ مہدی آزادی کے بعد ادبی و سماجی کام کرنے والوں میں ایک منفرد شخصیت ہیں۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر اختر الواسع نے کیا۔ وہ یہاں 'یاد میکش' پروگرام میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے اظہار خیال کر رہے تھے۔ اس سے قبل ادبی دنیا کا موقر ترین غیر سرکاری ایوارڈ 'میکش ایوارڈ' جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبۂ اردو کی پروفیسر صغریٰ مہدی کو پیش کیا گیا۔ صدر بزم میکش سید مرغوب الزماں نے انھیں شال اوڑھائی جب کہ سرپرست سید اجمل علی شاہ نے سپاس نامہ پیش کیا۔ سید شبر علی شاہ نے چاندی کا ایوارڈ پیش کیا اور جنرل سکریٹری ڈاکٹر نسرین بیگم نے تعارف۔ گیسٹ آف آنر وجے کمار، آئی پی ایس، اور میرٹھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے ڈاکٹر خالد حسین خاں نے تہنیتی تقاریر کی۔ این سی ای آر ٹی، نئی دہلی کے پروفیسر نعمان خاں، اسرار اکبر آبادی اور خوشبو عثمان نے مقالات پیش کیے۔ امیر احمد ایڈوکیٹ، سید معراج الدین، سید صنون احمد شاہ قادری، کے سی شریواستوا، مرزا شمیم بیگ، جتیندر رگھوونشی، محمود اکبر آبادی، ڈاکٹر ارشاد، سعید اللہ ماہر، شاہد ندیم وغیرہ نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اتر پردیش اردو اکادمی کے انعامات برائے مالی سال 2009-10

● مالی سال 2009-10 کے لیے مندرجہ ذیل اردو ادیبوں،

شاعروں اور صحافیوں وغیرہ کو انعامات دیے جانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

1۔ مولانا ابوالکلام آزاد انعام (قومی سطح پر ایک انعام)، پانچ لاکھ روپے، ممتاز معروف فکشن رائٹر جناب اقبال متین (حیدرآباد)، 2۔ امیر خسرو انعام (ایک انعام)، مبلغ ایک لاکھ پچاس ہزار روپے، جناب بیکل اتساہی (بلرام پور)۔3۔ مجموعی ادبی خدمات انعام (پانچ انعامات۔ محترمہ مسرور جہاں (لکھنؤ)، مبلغ ایک لاکھ روپے، جناب حنیف ترین (سنبھل)، مبلغ ایک لاکھ روپے، محترمہ ساجدہ زیدی (علی گڑھ)، مبلغ ایک لاکھ روپے، جناب محمد اسحاق صدیقی (لکھنؤ)، مبلغ ایک لاکھ روپے، جناب فضل حسنین (الہ آباد)، مبلغ ایک لاکھ روپے، 4۔ پریم چند انعام (ایک انعام)۔ ڈاکٹر پردیپ جین (مظفرنگر)، مبلغ ایک لاکھ روپے۔5۔ صحافت انعام (دو انعامات)۔ جناب اختر یونس قدوائی (پرنٹ میڈیا) لکھنؤ، مبلغ 50 ہزار روپے، جناب شفاعت علی صدیقی (الکٹرانک میڈیا) لکھنؤ، مبلغ 50 ہزار روپے۔6۔ میڈیا انعام۔ جناب طارق قمر (ای ٹی وی، اردو) لکھنؤ، مبلغ 25 ہزار روپے۔ 7۔ کتابت انعام۔ جناب ریاض احمد (الہ آباد)، مبلغ 15 ہزار روپے۔

2009 کی کتابوں پر انعامات

بیس۔ بیس ہزار روپے کے پانچ انعامات:

1۔ ترقی پسند تنقیدی کی تنقیدی تاریخ، پروفیسر سید محمد عقیل، 2۔ گنجفہ، پروفیسر نیر مسعود،3۔ انکشافات، پروفیسر محمد علی اثر، 4۔ بحث و تنقید، پروفیسر انیس اشفاق، 5۔ سرسید کا سفرنامہ لندن، پروفیسر اصغر عباس۔

پندرہ۔ پندرہ ہزار روپے کے دس انعامات:

1۔ کہانی کوئی سناؤ متاشا (ناول)، ڈاکٹر صادقہ نواب سحر،2۔ سوانحی انسائیکلو پیڈیا، ڈاکٹر رضا الرحمٰن عاکف سنبھلی ، 3۔ ہلکی ٹھنڈی ہوا، ظفر گورکھپوری،4۔ زاد المتقین فی سلوک طریق الیقین، پروفیسر مسعود انور علوی، 5۔ میر تنقید تذکروں سے عصر حاضر تک، ڈاکٹر ریشماں پروین 6۔ فیض کی شاعری میں اشتراکی رجحانات، ڈاکٹر عزیزہ بانو،7۔ لینڈرا (افسانے)، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، 8۔ جدید خواتین افسانہ نگار نظریہ اور تجزیہ، ڈاکٹر صالحہ زریں،9۔ عکس رخ گلبدن، کشمیری لال ذاکر، 10۔ آزاد ہندوستان میں عربی زبان وادب، ڈاکٹر محمد ارشاد ندوی نوگانوی۔

دس۔ دس ہزار روپے کے پندرہ انعامات:

1۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی کی ادبی خدمات، حنا فریں، 2۔ ڈاکٹر وحید اختر: حیات اور شاعری، ڈاکٹر سید علی سلمان رضوی، 3۔ چمن کو چلیے (ناول)، عبیدہ سمیع الزماں، 4۔ فارسی کلام اقبال کے منظوم اردو تراجم (ایک تقابلی مطالعہ)، فخر عالم اعظمی، 5۔ حرف زار، فاخر جلالپوری، 6۔ معاصرین داغ دہلوی، ڈاکٹر محمد عطا اللہ خاں، 7۔ جدید اردو شاعری پر فیض احمد فیض کے اثرات، ڈاکٹر ایس۔ ایم ہاشمی، 8۔ ہومیو: تشخیص کی کنجی درد کی علامت، ڈاکٹر خالد جاوید شمسی، 9۔ قوانین حفظان صحت، عبد القیوم قاسمی، 10۔ جہاں تک زندگی ہے، خوشبیر سنگھ شاد، 11۔ مسلمانوں کا شاندار ماضی، عبدالجبار اجمیری، 12۔ دائروں کے درمیاں، بشیر فاروقی، 13۔ دہلیز سے اترے پاؤں، شکیل جاوید، 14۔ شہر میرے خواب کا، شہاب الدین ثاقب، 15۔ غزل سنسار، عزیز الہ آبادی۔

پانچ۔ پانچ ہزار روپے کے چالیس انعامات:

1۔ فرقت کاکوروی: حیات اور کارنامے، ڈاکٹر آصفہ خاتون، 2۔ سید سعادت علی خاں: شخصیت وشاعری، پروفیسر عبدالمنان طرزی، 3۔ پروفیسر محمد ولی الحق انصاری بحیثیت اردو شاعری، ڈاکٹر جبار علی رضوان انصاری، 4۔ انوار تصوف، ڈاکٹر سیدہ عصمت جہاں، 5۔ علم اور دین کا ناقص تصور (ملت کے لیے ایک لمحہ فکریہ)، سید عاصم علی سبزواری ایڈوکیٹ، 6۔ تذکرہ شاعرات لکھنؤ (جلد اول)، ثمینہ فاروقی، 7۔ تنقید اور وزیر آغا کی تنقید، ڈاکٹر شاذیہ عمیر، 8۔ سکۂ خاک، سلطان سبحانی، 9۔ ٹوٹا ہوا سہارا، ڈاکٹر عبیداللہ چودھری، 10۔ زر نقد، محمد شاہد پٹھان، 11۔ نوائے حجاز، شارب کاکوروی، 12۔ کچھ تم چلو کچھ ہم چلیں، ڈاکٹر ایشور چند گمبھیر، 13۔ اعتراف سعادت، محمد اویس، سنبھلی، 14۔ شعرائے مرادآباد کی ادبی خدمات، ڈاکٹر فہمیدہ خاتون، 15۔ آپ ہیں (جلد 7)، عرفان عباسی، 16۔ لکھنؤ میں اردو مرثیے کا ارتقا، ڈاکٹر سید محمد ارشد رضوی، 17۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن: حیات اور کارنامے، ڈاکٹر خورشید عالم، 18۔ حسرت موہانی: شخصیت اور فن، ڈاکٹر ریحانہ صدیقی، 19۔ روشنائی کے سفیر، انور جلالپوری، 20۔ انور جلالپوری: شخصیت اور ادبی جہات، ڈاکٹر اسلم الہ آبادی، 21۔ عصمت چغتائی کی غیر افسانوی نگارشات، ڈاکٹر محمد اشرف، 22۔ محفل، جمیل احمد جمیل، 23۔ اردو میں سیاسی شاعری کی ادبی قدر وقیمت (1950-1900)، پرویز احمد اعظمی، 24۔ تفہیم وتعبیر، ڈاکٹر محمد علی جوہر، 25۔ پرواز، محمد معین انجم صدیقی، 26۔ مٹھی میں آفتاب، راشد الہ آبادی، 27۔ ارمغان شبلی، ڈاکٹر شاہد نوخیز اعظمی، 28۔ نقد ونوا، ڈاکٹر آفاق فاخری، 29۔ برگ نو، اختر شاہ جہاں پوری، 30۔ دعا زمین، پرویز کمار اشک، 31۔ اردو افسانے کا تنقیدی

جائزہ (1980 کے بعد)، ڈاکٹر احمد صغیر، 32۔ شاہ پر، محمد عابد علی عابد،33۔ اردو تحقیق اور مولانا امتیاز علی عرشی، ڈاکٹر صابر سنبھلی،34۔ امیر خسرو (اوپیرا)، فصیح اکمل، 35۔ میرے ڈرامے لندن میں، شمس الدین آغا،36۔ چندا ماما، شادان سلطانپوری،37۔ اردو شعر وادب کے فروغ میں نوابین رامپور کا حصہ، ڈاکٹر محمد الیاس، 38۔ ڈاکٹر بشیشر پردیپ: فکر وفن، ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی، 39۔ خانوادۂ شاہی، سید وجاہت شاہ،40۔ داعی اسلام، صادق علی صادق۔

ناشر ایوارڈ۔ مبلغ دس ہزار روپے:

محمد فیضان نگرامی ندوی، مولانا عبدالرحمٰن نگرامی اکادمی، لکھنؤ۔

(ڈاک سے)

● امروہہ۔ 27 مارچ، منڈی دھنورہ کے راشٹریہ کالج میں ہوئے پروگرام میں قصبے کے سرکردہ افراد کی موجودگی میں توفیق احمد چشتی کو 'جامع نوادرات' کے اعزاز سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر سنگھ کے صدر ستیندر کٹاریہ نے کہا کہ توفیق نے گورجر برادری نے 'گورجر رتن' سے نوازا تھا۔ توفیق چشتی امروہہ کے ہی نہیں بلکہ ہندوستان میں تاریخی اور پرانی اشیا کی کھوج کرنے اور ان کی تاریخی حیثیت کو نمایاں کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ پروگرام میں گورجر برادری کے یشپال، دیوبند پال شرما، شیوناتھ سنگھ سمیت سینکڑوں افراد نے شرکت کی۔

(ہندوستان ایکسپریس)

● پونے، 7 مارچ، 2010۔ پونے کے ڈرامہ تھیٹر تلک سمارک مندر میں ایف بی فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام اردو کے مشہور ادیب و ڈرامہ نگار قاضی مشتاق احمد کا تحریر کردہ ڈرامہ 'آتش کشمیر' بمبئی کے آئیڈیا گروپ نے مجیب خان کی ہدایت میں پیش کیا۔ یہ پہلا موقع ہے کہ ایک خالص مراٹھی علاقے میں اردو کا ڈرامہ کامیابی کے ساتھ پیش ہوا۔ 'آتش کشمیر' کے اس سے پہلے تین کامیاب شو ہو چکے ہیں چوتھی بار بھی اس کا گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔ اس موقعے پر مختلف شعبہ جات میں اپنی محنت اور قابلیت کی بنا پر احترام وعزت حاصل کرنے والی اہم ترین شخصیات کو اعزاز و اکرام سے نوازا گیا۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے پونے کارپوریشن کے ڈپٹی میئر پرسنا جگتاپ تھے۔ منور پیر بھائی (صدر اعظم ٹرسٹ) اور کارپوریٹر عارف نے مہمانان کی حیثیت سے شرکت کی۔ ڈپٹی میئر ایڈوکیٹ جگتاپ نے آتش کشمیر کی مقبولیت پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس ڈرامے کے ذریعے امن وقومی یکجہتی کا پیغام نہایت پرلطف اور موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ عارف نے کہا کہ یہ ڈرامہ پہلے سین سے ہی اپنی پکڑ مضبوط کر لیتا ہے جو اختتام تک قائم رہتی ہے۔ ڈپٹی میئر نے کہا کہ انھوں نے زندگی میں پہلی بار کوئی اردو ڈرامہ دیکھا ہے اور اس سے بے حد متاثر ہوئے ہیں۔ اردو تھیٹر کو ڈرامے کی دنیا میں بنیاد کا پتھر کہا جاتا ہے۔ اس بات کا اندازہ اس ڈرامے کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ اس ڈرامے کے فنکاروں نے اپنی بہترین اداکاری کا مظاہرہ کر کے عوام کا دل جیت لیا۔ درشن سنگھ (سو نومشرا)، گلزار خان (سچے کنوجیہ)، پنڈت اونکار پرساد (اشوک آنند)، نسرین (عیتا اگروال) نے خوب داد حاصل کی۔ دلاور خان، ڈاکٹر جلیس اور بلو کی اداکاری کرنے والی اداکارہ نے بھی خوب داد حاصل کی، ایف بی فاؤنڈیشن کے سربراہ حاجی نذیر احمد نے کہا کہ ہم تھیٹر کو عوامی رابطے کا موثر ذریعہ سمجھتے ہیں اور مختلف شعبہ جات میں خدمات انجام دینے والی اہم شخصیات کی پذیرائی کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اسی جذبے کے تحت امسال 'ایف بی فاؤنڈیشن اچیومنٹ ایوارڈ' کے لیے ان اہم شخصیات کا انتخاب ہوا:۔ محترمہ سشما نہار (کشمیر میں دہشت گردی کے شکار معصوم بچوں کی تعلیم وتربیت کا انتظام کرنے والی سرحد اسکول کی سربراہ)، قاضی مشتاق احمد (اردو کے نامور ادیب و ڈرامہ نگار)، امیش کلکرنی (مراٹھی انعام یافتہ فلم 'وہیر' کے ہدایت کار) استاد انور قریشی (ہندستانی کلاسیکل سنگیت کی خدمات)، مجیب خان (اردو تھیٹر کے احیا کے لیے سرگرم ہدایت کار) سید آصف (اردو ساہتیہ پریشد کے ذریعے اردو زبان کو غیر اردو داں طبقے میں عام کرنے کے لیے جدوجہد کرنے پر) پرویز قاضی (دلی کے نامور پینگوین پبلی کیشنز کی جانب سے بھارت ایکسلنس ایوارڈ ملنے پر) ایڈوکیٹ ایس اے رحمٰن (سماجی خدمت گزار)، راج اہیر راؤ (اردو/ہندی شاعری) (ڈاک سے)

رسم اجرا:

علی گڑھ موومنٹ رسالہ کے خصوصی شمارے کا اجرا

● علی گڑھ۔ 27 مارچ، علی گڑھ موومنٹ کے رہنما اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی سرسید احمد خاں کے 112 ویں یوم وفات پر انھیں

خراج عقیدت پیش کرنے کی غرض سے 'دی علی موومنٹ' رسالہ کی 'سر سید کے ایجوکیشنل موومنٹ' سیریز کا افتتاح اور علی گڑھ موومنٹ رسالہ کے خصوصی شمارے کا اجرا آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ویمنس پالیٹکنک کے پرنسپل اور ممتاز سماجی کارکن پروفیسر شمیم احمد نے کیا۔ اس موقعے پر اپنے خطاب میں پروفیسر شمیم احمد نے کہا کہ سر سید کی علی گڑھ تحریک آج ختم سی ہو گئی ہے اور اسے از سر نو جلا بخشنے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر محمد شاہد نے کہا کہ علی گڑھ موومنٹ رسالے کی یہ اچھی پہل ہے کہ وہ صحیح معنوں میں سر سید کے مشن کو لے کر چل رہا ہے۔ رسالے کے مدیر مسٹر جسیم محمد نے کہا کہ سر سید ایک اسکول آف تھاٹ کا نام ہے جسے ہم محض ایک تعلیمی ادارہ کے بانی کی حیثیت سے دیکھ رہے ہیں۔ جسیم محمد نے حکومت ہند سے اپیل کی کہ وہ پارلیمانٹ کے ہال میں سر سید کے یومِ پیدائش 17 اکتوبر اور ان کے یوم وفات 27 مارچ کو ان کو یاد کرے تاکہ ہندوستان کے سچے فرزند کا پیغام ہر ہندوستانی تک پہنچ سکے۔ پروگرام میں دولت رام، ایلزابیتھ مریم یمنا زین العابدین، فاطمہ زہرہ، وجیہہ مہدی، تمنا حسین، انصار ابوبکر، پی. جی. ایف صابری، فاروق خاں، جمال انصاری، اقبال سیفی، کپل، نکہت پروین وغیرہ موجود تھے۔

(ہندوستان ایکسپریس)

دیوبند کا ادبی سفرنامہ

● دیوبند۔ 7 اپریل، ادبی دنیا میں دیوبند کو نمایاں مقام حاصل ہے، دیوبند کی علمی و ادبی خدمات تاریخ ادب میں سنہرے حروفوں سے لکھی جائے گی ان خیالات کا اظہار جامعہ طبیہ میڈیکل کالج دیوبند کے سکریٹری ڈاکٹر انور سعید نے 'دیوبند کا ادبی سفرنامہ' کتابچے کی رسم اجرا کے موقعے پر کیا۔ انھوں نے کہا کہ علم و ادب کی سرزمین دیوبند کا ادبی شجرہ حبیب حسن وحشی سے شروع ہوتا ہے اور یہ حوالہ تاریخ دیوبند اور مطالعے کی بنیاد پر دیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس شجر کی کتنی شاخیں تھیں اس کا کوئی پختہ ثبوت نہیں ہے۔ دیوبند کی سرزمین نے ادب کے میدان میں وہ مختلف پھول کھلائے ہیں جن سے دیوبند کی ادبی تاریخ مہک رہی ہے، انھوں نے یاد کرتے ہوئے کہا کہ علامہ انور صابری، مولانا عامر عثمانی اور حافظ سید ازہر شاہ قیصر کو ان کی وفات سے طویل مدت کے بعد بھی یاد کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر انور سعید نے کہا کہ آج وقت کے ساتھ ساتھ دیوبند میں ادب کی مشعل نئے اور پرانے ہاتھوں میں ہے اس کی خدا کی قدرت ہی کہا جائے گا کہ مختلف حکومتوں اور دیگر افراد نے اردو کے خلاف سازشیں کی مگر یہ زبان اپنی چاشنی کی وجہ سے نسل در نسل منتقل ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر انور سعید نے کہا کہ اس وقت ادب سے وابستہ دیوبند کے حضرات کسی مخصوص موضوع کے دائرے میں قید نہیں بلکہ ان کا قلم ادبی، سماجی، سیاسی، مذہبی، معاشی اور دیگر موضوعات پر بھی گل افشانیاں کر رہا ہے۔ انھوں نے دیوبند کا ادبی سفر نامہ مرتب کرنے والے کمل دیوبندی اور اس کی اشاعت کے لیے اطہر عثمانی کو مبارکباد دی۔ دیوبند کے مقامی مشاعرے کے موقعے پر 'دیوبند کا ادبی سفرنامہ' کا اجرا رکن پالیکا معاویہ علی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ دیوبند علم و ادب کا گہوارہ ہے اور دیوبند کی ادبی تاریخ زریں الفاظ میں درج ہے۔ اس موقعے پر مقامی مشاعرے کے کنوینر اطہر عثمانی نے کہا کہ کسی بھی قوم کا ادبی خزانہ بیش قیمت سرمایہ ہوتا ہے جس کی حفاظت نسل در نسل منتقل کرنا ہم سب کا فرض ہے، انھوں نے کہا کہ ادب کسی بھی قوم و ملت، ملک و شہر کی پہچان ہے ان سب باتوں کے پیش نظر 'مقامی مشاعرہ و کوی سمیلن' کے موقعے پر اس کتابچے کی اشاعت کی جا رہی ہے جو نہ صرف ادب سے وابستہ دیوبندی شخصیات کو متعارف کرائے گی بلکہ ایک نئی روایت کا آغاز بھی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کتابچے میں دیوبند کی صحافت سے وابستہ دو شخصیات مسعود عثمانی اور اسلم انصاری، جو اب ہمارے بیچ نہیں ہیں، کی صحافتی خدمات کو پیش کرنا بھی ہمارے لیے سعادت کے درجے میں ہے۔ اطہر عثمانی نے کہا کہ سرزمین دیوبند کی میدان میں کسی تعارف کی محتاج نہیں مگر گاہے بگاہے اس کی اشاعت بھی لازم ہے۔ انھوں نے کتابچے کی اشاعت کے لیے معاونین کا شکریہ ادا کیا۔

(صحافت، دہلی)

'جام جہاں نما'

● نگینہ، 2 اپریل، نگینہ پترکار سنگٹھن کی جانب سے صوبہ اتر پردیش میں پہلی بار نگر پالیکا پریشد دفتر میں اردو صحافت پروگرام بعنوان 'ایک شام اردو صحافت کے نام' منعقد ہوا جس میں مختلف شعبوں میں عمدہ کارکردگی انجام دینے والی شخصیات کو اعزاز سے نوازا گیا۔ 1822 میں کلکتے سے شائع ہونے والے پہلے اردو اخبار 'جام جہاں نما' کے 188 سال مکمل ہونے پر پروگرام کا افتتاح شیخ خلیل الرحمٰن چیئرمین نے شمع

روشن کر کے کیا۔ میڈیا پوسٹ کے ایڈیٹر شیخ گنگوہی نے اردو صحافت کی تاریخ اور اردو صحافت کو فروغ دینے والے غیر مسلم صحافیوں کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ انھوں نے کہا کہ اردو اس ملک کی زندہ زبان ہے جس نے قومی یکجہتی، حب الوطنی، گنگا جمنی تہذیب کو فروغ دیا ہے۔ تاریخ بجنور کے مصنف شکیل بجنوری نے پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے جنگ آزادی میں اردو کے کردار اور بجنور ضلع سے شائع ہونے والے اردو اخبارات کی تاریخ پیش کی۔ محکمہ رابطہ عامہ اتر پردیش سے تشریف لائے ڈاکٹر ایم شیزی نے اردو کے موجودہ حالات کے لیے اردو طبقے کو ذمے دار ٹھہرایا۔ انھوں نے کہا کہ اردو ہندوستان جیسے جمہوری ملک میں لازمی ہے۔ اس پر بجنور ضلع کی صحافتی شخصیات مرزا طالب بیگ (روزنامہ خبر جدید) تنویر اختر (نئی دنیا اردو دہلی) ڈاکٹر شیخ گنگوہی (جدید مرکز)، ڈاکٹر محمد داؤد ملتانی (دعوت) حسنین نقوی (صحافت) مرغوب رحمانی (بجنور ٹائمس)، شکیل بجنوری (تاریخ ادب، بجنور)، ایم شیزی (آزاد صحافی)، ڈاکٹر ذکیہ رفعت (پی ایچ ڈی)، ڈاکٹر سبطین سیدہ (پی ایچ ڈی) حسن جاوید (سماجی کارکن)، سید زبیر زیدی (ہاکی)، سبھاش کپور (فٹ بال)، لبنا تبسم (گائیڈ) سنیل ساحل (شاعر)، راکیش بشنوری (گلوکار)، منور علی غلام فرید خاں، آچاریہ اجے تیاگی (کیناڈا)، بابو خاں، شاہ رخ خاں کو مہمان خصوصی ضلع پنچایت چیئر پرسن گایتری پراشر نے اعزاز سے نوازا۔ اس موقعے پر شام غزل کا پروگرام بھی پیش کیا گیا۔ پروگرام میں ایس ڈی ایم رام سیوک دیویدی نے اپنے اشعار سے لوگوں سے داد حاصل کی۔ پروگرام کے اختتام پر سنی گپتا صدر سنگھٹن و ڈاکٹر معظم ریاضی نے سبھی شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ (صحافت، دہلی)

وفیات:

نور جہاں ثروت

● نئی دہلی۔ 7 اپریل، معروف صحافی اور شاعرہ نور جہاں ثروت کا آج شام تقریباً پونے سات بجے پشپ وہار میں واقع پشپا انجلی نرسنگ ہوم میں انتقال ہو گیا جہاں انھیں آج صبح بے ہوشی کی حالت میں داخل کرایا گیا تھا۔ وہ 60 سال کی تھیں اور ان کے پسماندگان میں ان کی 6 بہنیں شامل ہیں۔ ان کے بھانجے افضل شاہ کے مطابق ان کی تدفین کل صبح 11 بجے قبرستان دہلی گیٹ میں عمل میں آئے گی۔ واضح ہو کہ نور جہاں ثروت کو 28 مارچ کو دہلی اردو اکادمی کی جانب سے ان کی شعری خدمات کے عوض ایوارڈ سے نوازا گیا تھا اور انھوں نے وزیر اعلیٰ کے ہاتھوں خود یہ ایوارڈ قبول کیا تھا۔ انھوں نے اس کے علاوہ بھی اپنی شعری اور صحافتی خدمات کے لیے ایوارڈ حاصل کیے، جن میں لالہ جگت نرائن ایوارڈ، ظفر میموریل ایوارڈ، میر تقی میر ایوارڈ وغیرہ شامل ہیں۔ 28 نومبر 1949 کو دہلی میں پیدا ہوئی نور جہاں ثروت کی ابتدائی تعلیم بلبلی خانہ سینئر سیکنڈری اسکول میں ہوئی۔ انھوں نے دہلی کالج سے بی اے اور دہلی یونیورسٹی سے 1971 میں اردو میں امتیازی حیثیت سے ایم اے کیا۔ نور جہاں ثروت نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں 15 روزہ سیکولر ڈیموکریسی کے ذریعے صحافتی کیریئر کا آغاز کیا تھا۔ اس کے بعد جے این یو میں لیکچرار کے طور پر خدمات انجام دیں۔

نور جہاں ثروت نے آل انڈیا ریڈیو میں براڈ کاسٹر کے طور پر بھی خدمات انجام دیں اور ادبی انٹرویوز کا سلسلہ شروع کیا۔ اسی دوران انھوں نے ایک شاعرہ کے طور پر اپنی شناخت قائم کی۔ 1974 میں ذاکر حسین کالج میں بطور لیکچرار ان کا تقرر ہوا۔ وہ ہندوستان کے علاوہ پاکستان، عراق، دبئی، جدہ، ریاض اور کئی بیرون ممالک کے مشاعروں میں بھی شریک ہوئیں۔ 1980 میں جب دہلی سے قومی آواز شائع ہوا تو وہ اس کے بنیادی ارکان میں شامل رہیں اور معروف صحافی عشرت علی صدیقی کی سرپرستی میں اپنے صحافتی کیریئر کو سنوارا۔ وہ قومی آواز کے ہفتہ واری ضمیمہ کی ادارت کے علاوہ روزنامہ کے دہلی ایڈیشن کی اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی رہیں۔ 1995 میں ان کا شعری مجموعہ 'بے نام شجر' شائع ہو کر مقبول ہوا۔ قومی آواز کے بند ہو جانے کے بعد جب دہلی سے روزنامہ 'انقلاب' 1987 میں شروع ہوا تو وہ اس سے منسلک ہو گئیں اور ریزیڈنٹ ایڈیٹر کے عہدے پر فائز رہیں اور گزشتہ سال تک انقلاب کے لیے اپنی خدمات انجام دیتی رہیں۔ وہ انقلاب کے لیے باقاعدہ کالم لکھتی رہیں۔ نور جہاں ثروت دہلی میں پہلی اردو صحافی رپورٹر تھیں۔ دہلی کی سڑکوں پر اردو میں غلط نام لکھے ہونے کے خلاف انھوں نے ہی سب سے پہلے مہم شروع کی تھی۔ وہ اردو اکادمی کی گورننگ کونسل کی رکن، علی منزل ٹرسٹ کی ٹرسٹی اور دہلی والے تنظیم کی نائب صدر سمیت مختلف انجمنوں کے عہدوں پر بھی فائز رہیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

تبصرہ و تعارف

سہ ماہی ''فکر و تحقیق'' جنوری تا مارچ 2010

صفحات: 160، قیمت: -/25 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی
مبصر: فیروز عالم، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد-500032

''فکر و تحقیق'' قومی اردو کونسل کا وہ تحقیقی اور علمی مجلہ ہے جس نے گذشتہ دس بارہ برسوں میں نہایت خاموشی سے اردو کے علمی و ادبی حلقے میں ایک خاص جگہ بنالی ہے۔ اس کا ہر مضمون کسی نہ کسی نئے پہلو کو آشکار کرتا ہے۔ اس کے قلم کاروں میں بزرگ بھی ہیں اور نوجوان بھی، پختہ کار بھی ہیں اور تازہ واردان بساط ادب بھی۔ کسی بھی قسم کی گروہ بندی اور ذہنی تحفظ کا شکار ہوئے بغیر یہ رسالہ ادب کی خدمت میں مصروف ہے۔

''فکر و تحقیق'' جنوری تا مارچ 2010 کا شمارہ حال ہی میں منظر عام پر آیا ہے۔ اس میں کل نو مضامین شامل ہیں اور بیشتر مضامین اپنے موضوع و مواد کے اعتبار سے شعبۂ ادارت کے ذوق انتخاب کی داد دیتے ہیں۔ پہلا مضمون معروف محقق پروفیسر حنیف نقوی کا ہے جس میں انھوں نے ''دستور الفصاحت اور شعرائے اردو'' کے زیر عنوان سید احمد علی یکتا کی کتاب ''دستور الفصاحت'' اور شعرائے اردو'' کا تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ یہ کتاب اردو شعرا کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ بنیادی طور پر صرف و نحو اور بدیع و بیان سے اس کا تعلق ہے۔ البتہ آخر میں کچھ شعرا کے سوانحی حالات اور کلام پر رائے دی گئی ہے۔ یکتا نے اس میں میر، سودا، درد، سوز، اثر، تاباں، بیان، مصحفی، جرأت، انشا وغیرہ کے بشمول 35 شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے شعرا کو کلام کی شیرینی، قوت طبع، شاعر کی شہرت کے لحاظ سے تین طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ یکتا نے شعرا کی شخصیات کے حسین مرقعے پیش کیے ہیں اور ان کے کلام پر بے لاگ رائے دی ہے۔

اس شمارے کا دوسرا مضمون ''شمس بدایونی کا ہے جس میں انھوں نے قائم چاند پوری کے شاگرد نواب محمد خاں میر کے حالات زندگی جو اب تک پردۂ خفا میں تھے، تلاش و تحقیق کے ساتھ پیش کیے ہیں۔ مضمون کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ نواب محمد خاں میر نے قصیدہ، مثنوی، مسدس، قطعہ، رباعی، غزل وغیرہ تمام اہم اصناف میں طبع آزمائی کی۔ افسوس کہ ان کا دیوان زمانے کی دست برد کا شکار ہوگیا۔ ان کا ذکر صرف تذکروں میں ملتا ہے۔ مضمون نگار نے تمام تذکروں سے ان کا کلام تلاش کرکے ا سے الف بائی ترتیب میں ردیف وار یکجا کردیا ہے۔ اس مضمون میں ان کی تمام غزلیں شامل ہیں۔ شمس بدایونی نے مختلف حوالوں کی مدد سے نواب محمد یار خاں امیر کی سن پیدائش 1736 قرار دی ہے۔ قیاس ہے کہ وہ آنولہ ضلع بریلی میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ ان کی وفات 39 سال کی عمر میں جنوری 1775 میں رام پور میں ہوئی۔

شرف الدین ساحل نے اپنے مضمون میں مولانا آزاد کی مذہبی فکر کا جائزہ ان کی مختلف تصانیف اور الہلال اور البلاغ کے مضامین کی روشنی میں لیا ہے۔ مولانا آزاد نے سیاسی، سماجی، دینی ہر قسم کے مضامین میں قرآن سے ہی روشنی حاصل کی۔ ان کے سیاسی مضامین میں قرآن کے حوالے دیکھ کر کسی نے خط لکھا تھا کہ سیاسی مباحث سے مذہبی تعلیم کو الگ ہونا چاہیے۔ مولانا آزاد نے ''الہلال'' مورخہ 8 ستمبر 1912 میں اس کا جواب یوں دیا۔ ''انسانی اعمال کی خواہ کوئی شاخ ہو، ہم تو اسے مذہب کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہمارے پاس اگر کچھ ہے تو صرف قرآن ہی ہے۔ اس کے سوا ہم اور کچھ نہیں جانتے۔'' مولانا کے نزدیک اسلام ہی وہ واحد مذہب تھا جو تمام انسانوں کی فلاح و بہبود کے لیے ایک جامع قانون لے کر آیا تھا۔ مولانا آزاد نے اپنے اکثر مضامین میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ مسلمانوں کے زوال کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے قرآن اور حدیث سے اپنا تعلق توڑ لیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمان اگر اسلام کے سچے پیروکار بن جائیں تو پوری دنیا ان کی اتباع کرے گی۔ بعد کے دنوں میں مولانا آزاد کی مذہبی فکر میں جو تبدیلی آئی وہ یہ تھی کہ تحریک آزادی کے زیر اثر وہ اتحاد اسلامی کے ساتھ ساتھ اتحاد قومی پر بھی زور دینے لگے۔

علامہ شبلی نعمانی بحیثیت انشا پرداز، سیرت نگار اور نقاد معروف ہیں۔ شاعری کے حوالے سے ان کا ذکر کم آتا ہے۔ محمد آصف قادری نے اپنے مضمون میں ان کی شاعری کے ایک اہم پہلو مزاحمتی شاعری کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ مولانا نے نہ صرف انگریزوں کے ظلم و استحصال کے خلاف اشعار کہے بلکہ اپنی قوم کو بھی محض بلند بانگ دعوے کرنے یا قسمت کا رونا رونے کی بجائے عمل کی ترغیب دی۔ کانپور میں ایک مسجد کی تعمیر

کے دوران انگریز سپاہیوں نے اندھادھند فائرنگ کی تھی جس میں بڑوں کے ساتھ بچے بھی شہید ہوئے۔ اس واقعے سے متاثر ہوکر شبلی نے ایک نظم کہی جس کے دو اشعار ذیل میں پیش ہیں:

شہیدانِ وفا کے قطرۂ خوں کام آئیں گے
عروس مسجد زیبا کو افشاں کی ضرورت ہے
عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں
یہ بچے ہیں سویرے ان کو سوجانے کی عادت ہے

شبلی نے برطانوی سامراج کے ظلم وتشدد، استحصال، ناانصافی اور کالے قوانین کے علاوہ جنگ بلقان پر بھی نظمیں کہیں۔ ان نظموں میں ادب عالیہ کی تمام خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ شبلی کا طنزیہ انداز ان کی اثرانگیزی میں مزید اضافہ کرتا ہے۔

''اردو شاعری میں صوفیانہ افکار اور سماجی ہم آہنگی کا میلان'' شیخ عقیل احمد کا مضمون ہے جس میں خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ نظام الدین اولیاؒ، بابا فرید شکر گنجؒ اور حضرت امیر خسروؒ وغیرہ کے صوفیانہ افکار اور غالب، صبا اکبر آبادی، فانی، جگر اور اقبال کے کلام میں متصوفانہ عناصر تلاش کیے گئے ہیں۔ مضمون نگار نے مغربی ادب میں روحانیت پر بھی مختصر روشنی ڈالی ہے اور ہندوستانی تاریخ میں اس کی روایات سے بھی واقف کرایا ہے۔ موجودہ دور میں سماجی ہم آہنگی اور مذہبی رواداری کے فروغ کے لیے شیخ عقیل احمد نے ان صوفیوں، سنتوں، رشیوں، منیوں کی تعلیمات پر عمل کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

سید اطہر رضا بلگرامی کے مضمون کا عنوان ''ہندوستان کے رثائی ادب کے عوامی اسالیب'' ہے۔ اس میں انھوں نے گاؤں، قصبات اور چھوٹے شہروں میں پڑھے جانے والے مرثیوں، نوحوں اور بین وغیرہ کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ یہ عوامی ادب کم تعلیم یافتہ یا ناخواندہ دیہی سماج کی زبان، ان کی سماجی و معاشرتی قدروں، روایتوں اور اعتقادات کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس میں سیدھی سادی زبان اور عام جذبات و احساسات کی عکاسی کی گئی ہے۔ ہر علاقے کی رثائی ادب میں وہاں کی مقامی زبان اور تہذیب وثقافت کی گہری چھاپ ملتی ہے۔ مضمون نگار نے میر انیس، خلیفہ محمد علی سکندر، افسردہ اور نجم آفندی کی رثائی تخلیقات میں بھی مقامی اثرات کی نشان دہی کی ہے اور عوامی ادب کے تحفظ اور اس کے رواج کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

محمد یعقوب اسلم نے اپنے مضمون میں تمل زبان کے اخلاقی صحیفے ''ترو کرل'' اور اس کے مختلف زبانوں میں تراجم پر گفتگو کی ہے۔ اس عالمی شہرت یافتہ شہہ پارے کے سیکڑوں تراجم دنیا کی مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ کرل تمل زبان کی صنف ہے۔ اس کا ہر شعر دوہے کی طرح دو مصرے پر مشتمل ہوتا ہے۔ پہلے مصرے میں چار ارکان ہوتے ہیں اور دوسرے میں تین۔ غزل کی طرح کرل کا ہر شعر بھی اپنے آپ میں مکمل ہوتا ہے۔ ترو کرل کا موضوع قدیم ہند د فلسفہ ارتھ، دھرم اور کام ہے۔ مضمون نگار نے ترو کرل کی فنی خصوصیات اور اس کے مصنف ترو ولور کے سوانحی حالات سے تفصیلی طور پر متعارف کرایا ہے۔ دیگر زبانوں کے علاوہ اس کے اردو تراجم اور مترجمین کا تعارف بھی مضمون میں پیش کیا گیا ہے۔

سید مسعود حسن نے اردو رسائل کے اب تک جتنے بھی اشاریے ترتیب دیے ہیں ان سب کا اشاریہ تیار کیا ہے جو تحقیق کے طلبہ کے لیے خاص طور سے بے حد مفید ہے۔

اس شمارے کا آخری مضمون گذشتہ صدی کی عظیم فکشن نگار قرۃ العین حیدر پر عصر حاضر کے اہم ادیب سید محمد اشرف کے قلم سے ہے۔ اس تاثراتی مضمون میں قرۃ العین حیدر کے افسانوی ادب پر لگائے جانے والے کئی الزامات کی تردید کی گئی ہے اور ان کی شخصیت کے کئی تاریک گوشوں کو منظر عام پر لایا گیا ہے۔

بحیثیت مجموعی نئے سال کا یہ پہلا شمارہ ہر اعتبار سے قابل تعریف داد وتحسین ہے اور ادب کے سنجیدہ قارئین کے لیے ایک بہترین تحفہ جو صرف 25 روپے میں دستیاب ہے۔

نشاط روح

شاعر: اصغر گونڈوی
صفحات: 73، قیمت: -/49 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی
مبصر: عبدالرشید اعظمی

زیر تبصرہ تصنیف اصغر گونڈوی کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ نام ''نشاط روح'' اصغر کے ایک شعر:

اصغر نشاط روح کا اک کھل گیا چمن
جنبش ہوئی جو خانۂ رنگیں نگار کو

سے اخذ کیا گیا ہے۔ اس کی پہلی اشاعت مطبع معارف اعظم گڑھ سے 1925 میں ہوئی۔ جسے مرزا احسان احمد نے مرتب کیا تھا۔ دوسری بار یہ مجموعہ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ سے 1982 میں شائع ہوا۔ قومی اردو کونسل نے اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ کے شائع کردہ نسخے کے عکس کو

مشترکہ معاہدے کے طور پر ازسرِنو 2006 میں 49 روپے قیمت کے ساتھ شائع کیا۔ قومی اردو کونسل کی ڈائرکٹر انچارج رشمی چودھری کے ایک صفحہ پیش لفظ کے ساتھ، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ کے چیئرمین مجلسِ انتظامیہ محمود الٰہی کی ایک صفحے پر مشتمل وضاحت درج ہے۔ بعدازاں مرزا احسان احمد کا تحریر کردہ دو صفحے کا دیباچہ ہے۔ نیز انھیں کا لکھا ہوا پندرہ صفحات پر محیط ایک وقیع مقدمہ درج ہے۔ جس میں آٹھ ذیلی عنوانات کے تحت اصغر گونڈوی کی سوانح اور کلام کی خصوصیات و جہات پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے اور کلام اصغر کے مضامین کو بڑی مہارت و خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔

کتاب کی قدرومنزلت اور مقبولیت میں اقبال سہیل کی پرمغز تحریروں نے چار چاند لگا دیے۔ دراصل اقبال سہیل نے کلام اصغر پر ایک بلیغ نقد و تبصرہ کیا ہے۔ انھوں نے اصغر کی شاعری کو چار نکات کے تحت اپنی ناقدانہ و حاکمانہ بصیرت کی روشنی میں بہ نظرِ صراف دیکھنے کی سعی حاصل کی ہے۔

1. موسیقی، 2. بت تراشی یا ایجاد و تخلیق، 3. مصوری، 4. اسرار و معارف، اقبال سہیل نے مذکورہ موضوعات کے تحت چند ذیلی عنوانات بھی تجویز کیے ہیں اور پھر ان کسوٹیوں پر کلام اصغر کے موضوعات وجہات اور نکات کو جانچنے و پرکھنے کے بعد اپنے نظریۂ شعروادب کی وضاحت کی ہے۔ اقبال سہیل کی گفتگو 23 صفحات کو محیط ہے۔ اس طویل گفتگو میں اقبال سہیل نے جہاں کہیں بھی اپنی حاکمانہ رائے دی ہے اور نکات پیش کیے ہیں، انھیں 'گزارش' ہی کا نام دیا ہے۔ اور خود کو بے بضاعت ظاہر کیا ہے۔ ان کا یہ رویہ حد درجہ منکسر المزاجی کی دلیل ہے۔ بقول اقبال سہیل:

> ''شاعری حقیقت میں حسن مجرد کی اس مصوری کو کہتے ہیں جس میں لطیف موسیقی بھی شامل ہو اور جب تک حسن صوری کی تمام اداؤں اور نغمۂ مادی کی تمام کیفیات کے لیے زبان میں الفاظ نہیں ملتے اور یہ کہنا پڑتا ہے کہ ''بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست'' تو یہ کیوں کر ممکن ہے کہ حسن معنوی اور نغمۂ روحانی یعنی شاعری جیسی ذوقی اور وجدانی چیز کی نسبت ہماری کیفیات نفسی کی تعبیر الفاظ میں کی جاسکے، اور وہ بھی جناب اصغر کی شاعری، جس کا ایک ایک حرف کمال شاعری کا دلکش ترین مرقع ہے۔ اس کی نسبت ناقدانہ حیثیت سے کچھ کہنا آسان نہیں۔ مجھ میں اس قدر بصیرت نہیں کہ میں ان کے کلام پر شایانِ شان تبصرہ کرسکوں۔''

یہ تحریر بھی اقبال سہیل کی ان کے حد درجہ انکسار و احتیاط پر مبنی۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ اقبال سہیل نے اصغر کی شاعری پر کماحقہ نقد و تبصرہ کر کے اپنی علمیت و فضیلت، بالیدگی فکر و دقت نظر اور کمال فن شعروادب کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ نیز مثبت انتقادی رویہ اختیار کیا ہے۔ اصغر گونڈوی کے کلام پر غور و فکر سے قبل، فن شاعری اور عناصر شاعری پر اقبال سہیل کے مبینہ عمومی نکات، شعروادب کا ایک میزان اور شہپارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان تحریروں سے اقبال سہیل کے نظریۂ شعروادب کی وضاحت ہوتی ہے۔ انھیں میزان پر اقبال سہیل نے اصغر کی شاعری کو پرکھنے کی کوشش کی ہے اور کلام اصغر سے وافر مثالیں پیش کی ہیں جو فلسفۂ حسن و عشق، اسرار و معارفت، موسیقی و مصوری، فلسفۂ سکر و فطرت اور غزل کی نزاکت و غزل کے مضامین سے متعلق ہیں۔

مرزا احسان احمد کے مقدمے اور اقبال سہیل کے نقد و تبصرے سے دبستانِ شبلی کی واضح جھلک نظر آتی ہے۔ دونوں افراد کے انتخاب عنوانات، ترتیب اور لفظیات میں نمایاں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ نیز شبلی و عبدالسلام ندوی کی جابہ جا تقلید دکھائی دیتی ہے۔ بایں ہمہ دونوں شخصیات دبستانِ شبلی کے معتبر ارکان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دیباچہ، مقدمہ اور اقبال سہیل کا طویل و بلیغ نقد و تبصرہ 41 صفحات پر محیط ہے۔ صفحہ 42 سے کلام اصغر کا آغاز ہوتا ہے اور صفحہ 73 پر اختتام۔ اولاً ایک لغت پاکؐ ہے۔ بعد ازاں دو نظمیں، بے خبری اور سرفنا، کے عنوان سے ہیں۔ اس کے بعد غزلوں کا سلسلہ صفحہ 47 سے شروع ہوتا ہے، جس میں طویل و مختصر 57 غزلیں شامل ہیں۔ جابہ جا صفحات پر تین تین اشعار بھی تحریر ہیں۔ دو صفحات پر مشتمل متفرقات درج ہے۔

کتاب کی پشت پر قومی کونسل کی چند مطبوعات کا اشتہار دیا گیا ہے۔ سرورق مرغزار سے مزین ہے۔ ارباب مذاق سخن و موزونی طبع کے لیے کتاب کا مطالعہ باعث متانت اور بالیدگی فکر و دقت نظر میں وسعت و اضافے کا سبب ہوگا۔

دانتے

مصنف: زیڈ۔اے۔ عثانی

صفحات: 205، قیمت: -/126 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، ونگ۔6، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی

مبصر: محمد اکبر، 147 ستلج ہوسٹل، جے۔ این۔ یو، نئی دہلی۔110067

اطالوی شاعر دانتے کا شمار دنیا کے عظیم ترین شاعروں میں ہوتا ہے۔ اس کی شاعری کا عالم یہ ہے کہ وہ درجہ کمال تک پہنچی ہوئی ہے۔ اس اطالوی شاعر نے زندگی اور فن کے حوالے سے مختلف نظریات پیش کیے ہیں اس کی شاعری فکر وفن کا بہترین نمونہ ہے۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جن کے سبب دانتے کو عالمی ادب میں شہرت وعظمت حاصل ہوئی۔

زیر تبصرہ کتاب میں زیڈ۔اے۔ عثمانی نے دانتے کی شخصیت اور ان کی شاعری کا بھرپور جائزہ لیا ہے جو دانتے کی فکر ونظر اور تفہیم میں بہت معاون ہے۔ پہلا مضمون دانتے کی حیات اور پس منظر کے عنوان سے ہے جو 23 صفحات پر مشتمل ہے اس میں دانتے کے حالات زندگی اور اس دور کے سماجی وسیاسی حالات کا اجمالی ذکر ہے۔ اس کے علاوہ اس کی علمی سرگرمیوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ زیر نظر مضمون میں مصنف نے دانتے کی زندگی کے مختلف گوشوں کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے مثلاً بیاترچے (Beatrice) سے عشق چرچ اور دانتے کی دشمنی، جلاوطنی اور ہمیشہ کے لیے سرکاری عہدے سے محرومی اور پھر جلاوطنی وغیرہ۔

جس طرح دانتے کی زندگی کو اس کے فن سے الگ کرنا مشکل ہے اسی طرح اس کے افکار ونظریات کو بھی اس کے فن سے جدا کرنا ناممکن ہے۔ تیرھویں صدی میں یورپ جس طرح خانہ جنگی کا شکار تھا اور چرچ کی مطلق العنانی تھی اس کے ثقافتی پس منظر کو ذہن میں رکھ کر دانتے نے ایک مخصوص مذہبی نظریہ قائم کیا۔ آج وہ اطالوی ادب کا اسطوری علامت بن گیا ہے۔

دوسرا مضمون ''حیات نو اور دیگر تصانیف'' کے عنوان سے ہے دانتے نے حیات نو بیاترچے کی مدت کے بعد تصنیف کی مذکورہ نظم دانتے کی زندگی کی عشقیہ داستان ہے۔ مذکورہ نظم کو ادب کے عالمی پیمانے پر پرکھا جاسکتا ہے۔ شاعر ہمیں بیاترچے سے پہلی ملاقات کے بارے میں بتاتا ہے اس وقت اس کی عمر نو سال کی ہوتی ہے اور بیاترچے کا نواں سال لگا تھا پھر آگے چل کر دانتے کی فکر ایک نیا موڑ لیتی ہے جو غنائیہ شاعری کی روایت میں ایک تاریخی موڑ ہے اس کے ساتھ واردات عشق میں تصوف اور مذہبی تجربہ کے تاثرات شامل ہوجاتے ہیں۔ دانتے نے لاطینی زبان میں ایک کتاب دیسی زبان کی فصاحت (De Vulgari Elogunita) کے نام سے تصنیف کی ہے جس میں دیسی زبان میں عظیم شاعری کے امکانات پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ جلاوطنی کے اوائل میں 1304 اور 1307 کے درمیان دانتے نے دعوت (Convivio) تصنیف کرنے کی کوشش کی جو مکمل نہ ہوسکی یہ کتاب بارپی (Barbl) کے مطابق حیات نو کی توسیع معلوم ہوتی ہے۔ دانتے خود کہتا ہے ''مجھے دعوت لکھنے کا خیال اس لیے ہوا کہ بہت سے لوگ میری شاعری کو محض ''عشق بازی'' سمجھ کر بدنام کرنے لگے تھے۔'' گویا جلاوطن ہوجانے کے بعد دانتے اپنے آپ کو ایک عالم کی حیثیت سے منوانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک نہایت جرأت مندانہ تجربہ کرنا چاہا، دعوت میں وہ علم کی دعوت دیتا ہے جو فرشتوں کی غذا ہے۔ ان ساری باتوں کو مصنف نے بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔

تیسرا مضمون طربیہٗ خداوندی اور اس کا خلاصہ ہے۔ طربیہٗ خداوندی لکھنے کا خیال دانتے کے ذہن میں پہلے سے یعنی حیات نو کو مکمل کرتے وقت موجود تھا۔ طربیہٗ خداوندی میں کل ملاکر 14233 مصرع اور 100 قطعات ہیں۔ اس نظم کے تین حصے ہیں جہنم، مقام کفارہ اور جنت، ہر حصے کے الگ الگ عنوانات قائم کرکے مصنف نے مدلل بحث کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ طربیہٗ خداوندی یعنی اس کی تینوں جہتیں جہنم، مقام کفارہ اور جنت ہماری اپنی دنیا کے تمدید معلوم ہوتے ہیں۔ اس کتاب میں اردو کے عظیم شاعر علامہ اقبال کی معروف تصنیف، جاوید نامہ کو جو دانتے کی شاعری سے موضوعاتی مماثلت رکھتی ہے، چند بنیادی شرائط کی روشنی میں مطالعہ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ یہ مطالعہ اگر اردو کی شعری اور ثقافتی روایات کے سیاق وسباق کو نظر میں رکھ کر کیا جائے تو یقیناً اقبال اور دانتے کے مابین فکری اور ثقافتی ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ تضادات اور مذہبی افکار کو بھی پرکھا جاسکتا ہے۔ اس کتاب کی تصنیف کا مقصد نہ صرف یہ کہ اردو داں حضرات کو دانتے اور اس کی شاعری سے متعارف کرانا ہے بلکہ اقبال کے الفاظ میں خلاقی، مشاقی اور آفاقیت گیری کے اس بلند معیار کی طرف اشارہ کرنا ہے جو فن کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ ہر اعتبار سے انسانی روح کی عظمت کا معیار ہے جو صفات الٰہیہ کو منعکس کرتی ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب اپنے موضوع پر معلومات کا خزانہ ہے اس نوعیت کی کتابیں اردو میں شاذ ونادر ہی لکھی جاتی ہیں اس کی طباعت دیدہ زیب ہے۔ پروف ریڈنگ پر خاص توجہ دی گئی ہے قیمت بھی مناسب ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ ہر باذوق قاری کے لیے نہایت مفید ثابت ہوگا۔

تیز ہوا کے جھونکے (شعری مجموعہ)

شاعر: ظفر انصاری ظفر

صفحات: 144، قیمت: -/250 روپے

ناشر: علمی مجلس، پٹنہ، بہار

مبصر: احمد کفیل، جے این یو، نئی دہلی

ظفر انصاری ظفر اردو کا ایک نوخیز شاعر ہے۔ شاعری سے اسے والہانہ لگاؤ ہے۔ اب سے قبل دیگر شعری مجموعوں اور رسائل میں اپنی غزلوں کی اشاعت سے ادبی منظرنامے پر ظفر کا نام اعتبار حاصل کرنے لگا ہے۔ شاعری میں غزل گوئی ظفر کا اصل میدان ہے۔ لہٰذا یہ مجموعہ بھی غزلوں پر مشتمل ہے۔ غزل کی روایت عشق و محبت سے عبارت ہے، ظفر بھی اسی روایت کا امین ہے۔ غمِ جاناں کے ساتھ غمِ دوراں بھی اس مجموعے میں شیروشکر ہے۔ ظفر کی شاعری کی عمر دو دہائیوں کو عبور کر رہی ہے۔ اگرچہ اس مجموعے میں کچھ کمزور غزلیں بھی شامل ہیں لیکن بعض غزلیں استادانِ فن سے بھی داد پانے کا حوصلہ رکھتی ہیں۔

''تیز ہوا کے جھونکے'' ظفر کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ جو حال ہی میں منظرعام پر آیا ہے۔ اس مجموعے میں 2000 سے 2008 کے درمیان کہی گئی غزلیں یکجا کی گئی ہیں۔ ان غزلوں کی کل تعداد ایک سو اکیس ہے۔ یہ غزلیں وارداتِ قلب او رمطالعۂ عصر کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان کی توضیح یہ ہے کہ حسن و شباب کا ایک پاک طینت شیدائی پریوں اور تتلیوں کو پکڑنے میں ناکام کفِ افسوس مل رہا ہے یا پھر زمانے کی شعبدہ بازیوں سے بیزار اپنے وقت کا مرثیہ سنا رہا ہے۔ شاعر کا محبوب خیالی یا ماورائی نہیں، مجسم ہے۔ عشق میں ناکامی عذاب جان بن جاتی ہے۔ زندگی کی یہ فطرت اس شعری روایت سے پوچھیے جس کے شیدائیوں میں وہ بھی تھے جن کے سرہانے سرگوشی کی بھی اجازت نہ تھی اور ''حالت اضطراب کی سی'' ہوگئی تھی۔ وہ بھی تھے جو اوروں پر راز نہ کھولنے کی تنبیہ کرکے خود ہی اپنا راز کھول گئے اور ''غمزۂ غماز'' کو چھپا نہ سکے۔ اس شعری روایت کی رو آگے بڑھی اور داغ، امیر، حسرت، اختر شیرانی، جوش، مجاز، ساحر اور جاں نثار جیسے شعرا سامنے آئے۔ انھی شعرا کی صف میں آج ایک نوخیز ظفر بھی کھڑا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

بچپن کے بانکے موسم میں جس کے پیچھے دوڑا تھا
وہ تتلی تڑپانے کو کچھ یاد سہانی چھوڑ گئی

اسے رکھو مری نظروں کی پہرے داری میں
تمھارا جسم بنایا گیا ہے سونے کا

سنوار دیتے ہیں پہلے ہم ان کی زلفوں کو
پھر اس کے بعد انھیں آئینہ دکھاتے ہیں

پابہ زنجیر ہونا وحشی کا
ہے علامت بہار آنے کی

رموز عشق زمانے پہ آشکار نہ کر
کسی کے غم میں گریباں کو تار تار نہ کر

ظفر کی شاعری کا یہ رنگ اب زمانے کی سفاکی کو اپنی گرفت میں لے رہا ہے۔ اسے اپنے گرد و پیش کے حالات اور ماحول سے اتنا ہی پیار ہے جتنا ایک محبوب سے ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی کسک بھی ویسی ہی ہے جو محبوب کی کسک ہے۔ اس نے زمانے کے غم کو اپنے عشق میں ڈھالا ہے جو شعری ریاضت کی ایک منزل کے عبور کرلینے کا پتا دیتا ہے۔ مثلاً

ہر ستم کرنے سے پہلے یہ ذرا سوچ بھی لے
میں جو بکھرا تو تری زلف بکھر جائے گی

منظر تمنا کو یہ نظر بھٹکتی ہے
پُرفریب کس درجہ آگہی کا منظر ہے

پھر زندگی اور حالات کا نکھرا ہوا روپ جس میں دل کی بے چینی اور حالات کو محبت کے کاسے میں پلٹ دینے کی تمنا کلبلا رہی ہے:

اسی پہ دونوں جہاں کا نظام قائم ہے
پیامِ عشق و محبت جہاں میں عام کرو

جس کے تیور سے کبھی موج بلاتھی برہم
آج کیوں ہے لبِ ساحل وہ سفینہ ٹھہرا

یہ کوئی شہرِ تمدن میں کہہ رہا تھا ظفر
برہنہ جسم ہوں دینا کوئی لباس مجھے

رات لے کے آتی ہے جب لہولہو منظر
تب کہیں نیا سورج دہر میں نکلتا ہے

ظفر کی شاعری دل سے دنیا تک کے سفر میں ہے، اور جست لگانے کے بجائے سبک روی سے منزل کی جانب گامزن ہے۔ اس نے اپنی زمینیں نکالی ہیں۔ اساتذہ میں ولی، غالب اور شہر یار کی زمینوں میں بھی معرکے سر کیے ہیں۔ سادگی اس کی شعری زبان کا طرۂ امتیاز ہے۔ بیان اور موضوعات دونوں میں وسعت ہے۔ شعروں کی قرأت سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر اگر اپنے جوہر کو سمیٹے تو مخزن بن سکتا ہے۔ اس مجموعے میں کئی ایسی غزلیں شامل ہیں جو گہری مشق و ریاضت کی اطلاع دیتی ہیں، ان میں تغزل کی چاشنی بھی ہے اور معنوی سبک خرامی بھی۔ ان کی فہرست سازی تو یہاں ممکن نہیں نموناً مطلع کے چند مصرعے— گلشن کے ہر گوشے میں پر درد کہانی چھوڑ گئی، کبھی یقین پکارے کبھی قیاس مجھے، جو زمانے کے لیے منظر عنقا ٹھہرا، ہم سے بلائے عشق تو ٹالی نہیں گئی، مصلحت کی پاؤں میں

زنجیر ہے، فصیل شب گرانا آ گیا ہے، یہ نہ کہیے کہ مٹی بھی ہے سیاہی کتنی، میں اچھی طرح آپ کو پہچان رہا ہوں، پیش کیے جاسکتے ہیں۔

یہ مجموعہ بہار اردو اکادمی کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوا ہے۔ تزئین و آرائش میں دلکشی اور جاذبیت ہے۔ بیک ٹائٹل پر شاعر کی تصویر ہے۔ مجموعے کا انتساب اپنے معنوی استاد حمید ویشالوی (مرحوم) کے نام ہے جن سے ظفر نے شرف تلمذ حاصل کیا ہے۔ فلیپ کے دائیں جانب استاذی ڈاکٹر مظہر مہدی حسین اور بائیں جانب فلیپ پر عالم خورشید نے ظفر کی شاعری پر اپنے کلیدی تاثرات پیش کیے ہیں۔ شاعری اور اس کی فنی باریکیوں پر اظہار خیال ظفر نے تین صفحے کے ''پیش لفظ'' میں کیا ہے۔ اس کے بعد تیرہ صفحے میں ڈاکٹر مولا بخش کا پرمغز ''دیباچہ'' شامل ہے۔ مجموعے کی ابتدا روایتی طور پر حمد یہ غزل سے ہوتی ہے۔ اس ''حمد'' کا یہ پہلا شعر پورے مجموعے کا استعارہ ہے:

رونق ارض و سما تیرے نام
زندگی بخش فضا تیرے نام

اردو انشائیہ اور احمد جمال پاشا

مصنف: ڈاکٹر سید معصوم رضا
صفحات: 144، قیمت:-/75 روپے
ناشر: مصنف، C-123 تیسری منزل، ویسٹ ونود نگر، دہلی-92
مبصر: عبدالرب، 265 سابرمتی ہاسٹل، جے. این. یو. نئی دہلی-67

احمد جمال پاشا کا شمار اردو کے ان چیدہ مزاح نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے نہ صرف یہ کہ بہت کم عرصے میں اہل نظر کو اپنی جانب متوجہ کرلیا بلکہ ان کی تحریریں اردو کے مزاحیہ ادب میں قابل قدر اضافے کا باعث ہوئیں لیکن پاشا بھی اسی بے قدری کا شکار ہوئے جو اس صنف ادب کے بیشتر قلمکاروں کا مقدر ہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں اسی بے مہری زمانہ کے شکار ادیب کے فکر وفن کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اس کتاب کا پہلا باب ''اردو انشائیہ ایک تجزیہ'' ہے اس باب میں مصنف نے انشائیہ کی افہام وتفہیم کی کوشش کی ہے۔ ہر چند کہ اب انشائیہ کو ایک قابل ذکر صنف کی حیثیت حاصل ہے اور اس کے نمونے اردو میں کثرت سے دستیاب ہیں۔ تاہم اب بھی انشائیے کی تعریف میں مختلف رائیں سامنے آتی ہیں۔ ڈاکٹر سید معصوم رضا نے انشائیہ کے فن پر گفتگو کرتے ہوئے اس سلسلے میں پیش کی گئی اہم آرا کو زیر بحث لاکر انشائیہ کے خدوخال کو واضح کرنے کی عمدہ کوشش کی ہے۔

دوسرا باب احمد جمال پاشا کی شخصیت اور فن سے متعلق ہے اس باب میں پاشا کی شخصیت کے تعلق سے تمام ضروری معلومات فراہم کی گئی ہے۔ ان کی ابتدائی زندگی، ادبی سفر کا آغاز اور پھر جلد ہی ادبی دنیا میں ایک جگہ بنالینا اہمیت کا حامل ضرور ہے۔ اسی باب کے آخر میں پاشا کی ادبی خدمات کی تمام جہتوں کو واضح کرنے کے لیے مختصراً ان کے مختلف ادبی اصناف پر لکھی گئی تحریروں کا جائزہ لیا ہے مثلاً طنز ومزاح، پیروڈی، خاکہ نگاری، تحقیق وتنقید اور صحافت وغیرہ کے میدان میں پاشا کی خدمات اور ادبی دنیا میں ان کا مقام متعین کرنے کی سعی کی ہے۔

تیسرے باب میں پاشا کے ممتاز معاصرین کے فکر وفن پر بحث کی گئی ہے جس سے احمد جمال پاشا کے عہد میں طنز ومزاح کی صورت حال کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے ان کے عہد میں طنز ومزاح نگار کی حیثیت سے جو نمایاں لکھنے والے تھے ان میں پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی، کنہیا لال کپور، کرشن چندر، فکر تونسوی، یوسف ناظم، اندر جیت لال، مجتبیٰ حسین جاوید وششٹ، سید محمد حسنین، رام لعل نابھوی، سید ضمیر حسن دہلوی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ رضا صاحب نے نہایت اختصار سے ان ادیبوں کے فکر وفن پر گفتگو کرتے ہوئے ان کے امتیازات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے نیز طنز وظرافت کے میدان میں ان کے کارناموں کی جانب توجہ دلائی ہے۔

چوتھا باب ''احمد جمال پاشا کی انشائیہ نگاری کا تجزیاتی مطالعہ'' ہے جس میں ان کے فنی امتیازات کو نشان زد کیا گیا ہے۔ احمد جمال پاشا کی انشائیہ نگاری کے سلسلے میں عابد سہیل نے لکھا تھا۔ ''جمال کا فکری سفر مزاح سے طنز کی جانب تھا لیکن انھوں نے شروع ہی میں جن اوزاروں کا انتخاب کیا تھا یعنی رعایت لفظی اور ہم صوت الفاظ سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش، ان سے وہ طنز کا بھی کام لیتے رہے جس کی وجہ سے ان کے طنزیہ مضامین میں وہ خشکی اور واعظ تنگ نظر کی وہ تندی اور سخت گیری نہ پیدا ہوئی جس کا شکار اکثر طنز نگار ہوجاتے ہیں۔''

اس سے ظاہر ہے کہ احمد جمال پاشا معمولی طنز ومزاح نگار نہیں ہے ان کی چلبلی شخصیت اس زمانے کے لکھنؤ میں یوں بھی مرکز توجہ تھی اور ان کے دلچسپ واقعات اب بھی ہمارے اجتماعی حافظے کا حصہ ہیں جس کا ذکر ہر وہ شخص کرتا ہے جو لکھنؤ کی بزم آرائیوں پر قلم اٹھاتا ہے۔ ڈاکٹر سید معصوم رضا نے ''اردو انشائیہ اور احمد جمال پاشا'' کے ذریعے اردو طنز ومزاح کے ایک انتہائی اہم لیکن گم گشتہ کردار کی بازیافت کی کوشش کی ہے جو امید ہے کہ پسند کی جائے گی۔

تمل ناڈو میں مسلمان

مصنف: مختار بدری

صفحات: 352، قیمت:-/200 روپے

ناشر: اے، سعادت الابرار، مجیدیہ پریس، چنئی-5

مبصر: ڈاکٹر ودیم اقبال، محلہ، قاضی سرائے اوّل، نگینہ، ضلع: بجنور، یوپی-246762

تمل ناڈو میں تمل بولنے والے مسلمانوں کی خاصی تعداد آباد ہے جو بڑے مستقل مزاج، خوش اخلاق، ایماندار، عدل پرور اور اصول پسند ہونے کے ساتھ ساتھ تجارت سے واسطہ رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی دلچسپی ہمیشہ اپنے خاندانی معاملات اور تجارت تک ہی محدود رہی ہے، جس کے سبب وہ کبھی سفاک پرتگالیوں کے قہر وغضب کا نشانہ بنتے رہے تو کبھی اپنے ہی ہم قوم دکھنی مسلمانوں کی نفرتوں کا بھی انھیں سامنا رہا۔ غرض قدم قدم پر سازشیں ان کا پیچھا کرتی رہیں اور انھیں اپنے دین کے تحفظ میں بڑی قربانیوں کو برداشت کرنا پڑا، کیونکہ دکھنی مسلمانوں کی دلچسپی فوج اور حکومت میں تھی لہٰذا وہ ملک کے مختلف حصوں مثلاً بیجاپور، گول کنڈا اور شمالی ہندوستان وغیرہ سے آئے تو کبھی میسور سے حیدرعلی اور ٹیپو سلطان کی افواج کے ساتھ یہاں آئے اور یہاں کے شہروں کا نظم و نسق سنبھالا اور یہیں کے باشندے ہو کر رہ گئے۔ اس طرح تمل ناڈو میں مسلمانوں کی دو اقسام آباد ہیں ایک قسم مقامی لوگوں پر مشتمل ہے جن کی دلچسپی جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا اپنے خاندانی معاملات اور تجارت تک محدود ہے تو دوسری قسم میں وہ لوگ شمار ہوتے ہیں جو ملک کے مختلف حصوں سے آکر یہاں آباد ہوئے اور ان کی دلچسپی سیاسی معاملات اور انتظامی امور میں تھی اب ظاہر ہے زبان اور تہذیب میں فرق کی بنیاد پر یہ لوگ آپس میں گھل مل نہ سکے اور آج بھی ان میں یہ فرق نمایاں ہے مگر نماز کے اوقات میں یہ بھی کاندھے سے کاندھا ملا کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس طرح احساسِ دوئی ان لمحات میں بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ یوں تو محترم علیم صبا نویدی نے تمل ناڈو کی ادبی تاریخ پر بڑی معلومات افزا کتابیں تحریر کی ہیں مثلاً تمل ناڈو میں نعت گوئی، تمل ناڈو میں رباعیات او رقطعات، تمل ناڈو کے مشاہیر ادب، تمل ناڈو کی خواتین قلم کار، تمل ناڈو کے صاحبِ تصنیف علما اور تاریخ اولیا وغیرہ مگر ایک اہم موضوع جو علیم صبا نویدی کی دسترس سے ابھی محروم تھا اس پر کام کیا ہے اردو ادب کی ایک اہم شخصیت مختار بدری صاحب نے اور وہ موضوع ہے ''تمل ناڈو میں مسلمان''۔ بلاشبہ تمل ناڈو کے یہ مسلمان اس کے مستحق تھے کہ ان کی تاریخ قلم بند کی جائے۔ جو اتفاق سے ابھی تک نہ ہو سکی تھی۔ زیرِ تبصرہ کتاب ''تمل ناڈو میں مسلمان'' میں مصنف نے جن عنوانات کے تحت تمل ناڈو کے مسلمانوں کی تاریخ قلم بند کی ہے ان کی تفصیل اس طرح ہے۔ تمل ناڈو میں مسلمان، تمل ناڈو میں مسلمان سیاست و تجارت، تمل ناڈو میں مسلمان اور یورپی اقوام، تمل ناڈو: مقامی حکمرانوں کی آزادی کی جدوجہد، تمل ناڈو کے مسلمان اور جنگِ آزادی، آزادی کی مختلف تحریکوں میں تمل ناڈو کے جن مسلمانوں نے حصہ لیا ان کی فہرست، تمل ناڈو کی قدیم بندرگاہیں، تمل ناڈو کے تاریخی شہر اور بستیاں، تمل ناڈو میں مسلمان: قومی یکجہتی کی نادر مثالیں، تمل ناڈو کے اولیا کرام اور صوفیا اعظام، تمل ناڈو میں مسلمان: چند مقتدر شخصیتیں، تمل ناڈو کے مسلمان: رسم و رواج، تمل ناڈو میں اردو صحافت، تمل ناڈو میں تصنیفات و تالیفات، تمل ناڈو میں اردو زبان کی تعلیم، تمل ناڈو میں عربی مدارس اور مسلم یتیم خانے، تمل ناڈو کے اردو شعرا: مختصر مختصر، تمل ناڈو کے مسلمان: اور موجودہ مقامی سیاست، تمل ناڈو کی سیاست کی اہم شخصیتیں، تمل ناڈو میں اردو تعلیمی اداروں کی صورتِ حال، تمل ناڈو میں اردو کی صورتِ حال اور تمل ناڈو کے اردو اسکولوں کی فہرست۔

ایسا لگتا ہے مصنف نے ڈیڑھ درجن سے زائد شامل کتاب ان موضوعات میں سے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا ہے اس کا حق ادا کر دیا ہے اور تحقیق و تصدیق کے بعد جو کچھ تحریر کیا ہے وہ ان کی بھرپور علمی بصیرت کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ اسی بنیاد پر امید کی جاتی ہے کہ آئندہ تمل ناڈو کے مسلمانوں کے حوالے سے کام کرنے والے ریسرچ اسکالرس کے لیے یہ کتاب کافی مفید ثابت ہوگی اور ادب میں خاطر خواہ پذیرائی حاصل کرے گی نیز پبلک لائبریری اور ذاتی کتب خانوں کی زینت بنے گی۔

شاد عارفی: فن اور فنکار

مصنف: ڈاکٹر مظفر حنفی

صفحات: 280، قیمت:-/200 روپے

ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی-110002

مبصر: ابرار احمد اعظمی، کمرہ نمبر-155، سابرمتی ہاسٹل، جے. این. یو، نئی دہلی-67

''شاد عارفی: فن اور فنکار'' مظفر حنفی کا تحقیقی مقالہ ہے جسے نظرِ ثانی کے بعد کتابی شکل دی گئی ہے۔ اس کتاب میں مظفر حنفی نے اپنے مشفق استاد کی حیات اور فن پر روشنی ڈالی ہے۔ اس سے قبل پہلے بھی انھوں نے شاد عارفی کی شاعرانہ عظمت کو اجاگر کرنے کے لیے مختلف نقادوں اور فنکاروں کے مضامین کو جمع کر کے ''ایک تھا شاعر'' کے نام سے ایک کتاب ترتیب دی تھی جو کافی مقبول ہوئی۔ لیکن وہ ان کے تمام پہلوؤں کا

احاطہ نہیں کرتی تھی۔ اب یہ ان کی دوسری کتاب اس خلا کو پُر کرنے کی ایک مخلصانہ کوشش ہے جو قدرے مکمل اور زیادہ مفصل انداز سے ان کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے سے شاد عارفی کی شاعرانہ، خلاقانہ اور ناقدانہ عظمت اور کمال کے راز کھلتے ہیں۔

شاد عارفی پر یہ اہم ترین کتاب بڑی جدوجہد اور بڑی جانفشانی کے بعد پایۂ تکمیل کو پہنچی ہے۔ کتاب کا مقدمہ اور کتابیات میں 122 کتابوں کے حوالے اور پتے اس بات کے غماز ہیں کہ مظفر حنفی نے معلومات اکٹھا کرنے کا کوئی ذریعہ باقی نہیں چھوڑا اور پھر ان کو شاد عارفی سے اس قدر والہانہ محبت اور گہری عقیدت ہے کہ شاید ہی کسی دوسرے شخص کو ہوگی۔

کتاب کے آٹھ ابواب ان کی علمیت اور عقیدت دونوں کی مظہر ہیں۔

پروفیسر مسعود حسین کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔

''غالباً یہ مقالہ ڈاکٹر مظفر حنفی کے لیے وجہ تسلی بھی ہوگا اس لیے کہ شاد عارفی کو ان سے بہتر سوانح نگار اور ناقد اور انھیں شاد عارفی سے بہتر ممدوح نہیں مل سکتا تھا۔''

اس کتاب کے ابتدائی دو باب ''سماجی اور ادبی پس منظر'' اور ''سوانح حیات اور شخصیت'' میں شاد عارفی کی پیدائش، تعلیم اور ادبی زندگی کے علاوہ شاد عارفی کے ذہنی ارتقا کی تعمیر و تشکیل میں جو انفرادی یا اجتماعی طاقتیں کام کرتی ہیں اور جو جسمانی و روحانی عناصر اثر انداز ہوئے ہیں ان سب پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ میرے خیال میں ایسا کرنا بے حد ضروری تھا کیونکہ ادیب کی شخصیت و عظمت کا صحیح اندازہ اس کے پورے ماحول کے تناظر میں ہی کیا جاسکتا ہے۔

اردو ادب کی مختلف اصناف سخن غزل، نظم، رباعی، نعت، منقبت، سلام، قطعات، سہرے، بچوں کے گیت، تخلیقی اور تنقیدی مضامین اور خطوط میں شاد عارفی نے جو کارنامے انجام دیے ہیں اور اضافے کیے ہیں ان کی نوعیت، انفرادیت، افادیت کو ذہن میں رکھتے ہوئے اگلے پانچ ابواب میں ان کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے اور ساتھ ہی مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتے ہوئے اس کی ادبی اہمیت کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ ان ابواب میں شاد عارفی کی فلسفیانہ حیثیت پر بھی بحث کی گئی ہے مگر زیادہ تر ابواب میں شاد کو ادیب، فنکار اور زبان داں کی حیثیت سے ہی پیش کیا گیا ہے۔

شاد عارفی کے علم، عقیدے اور دور کا جائزہ لے کر مظفر حنفی آخری باب میں شاد کی عظمت بیان کرتے ہیں۔ یہاں وہ سابقہ بحثوں سے اخذ کردہ نتائج اور ادبا و ناقدین کی آرا کی روشنی میں شاد عارفی کے ادبی مقام کو متعین کرتے ہیں۔ کتاب کے آخر میں تلامذۂ شاد کے نام اور ان کی غیر مطبوعہ تخلیقات کی فہرست بھی شامل کردی گئی ہے۔ جس سے شاد کی ادبی حیثیت مسلم ہوجاتی ہے۔

''شاد عارفی: فن اور فنکار'' اردو کی ایک اہم تصنیف ہے جو نہ صرف شاد عارفی کے فکر و فن کے گوشوں کو منور کرتی ہے بلکہ اس وقت کے ادبی، سیاسی اور ثقافتی صورت حال کا بھی معروضی جائزہ پیش کرتی ہے۔ توقع ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کی پذیرائی ہوگی۔ □□□

دکنی لغت

مرتبہ: سیّدہ جعفر

دکنی شعر و ادب کی تفہیم، ہماری ادب فہمی کا ایک اہم پہلو ہے۔ پروفیسر سیّدہ جعفر نے، جو اردو زبان و ادب کی تاریخ پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ دکنیات کا بھی پاکیزہ ذوق رکھتی ہیں، اس لغت کی تدوین و ترتیب میں دکنی الفاظ، محاورات، ضرب الامثال، روزمرّہ، تکیہ کلام اور ان کے معانی کی مختلف جہات کا احاطہ کیا ہے۔ ساڑھے پانچ سو برس قدیم ان دکنی الفاظ کا صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنا اس لیے ناگزیر ہے کہ زیر اور زبر سے معنی میں بہت تبدیلی آجاتی ہے۔ طلبہ و اساتذہ کی اسی ضرورت او رسہولت کے پیش نظر قومی اردو کونسل نے حال ہی میں یہ لغت شائع کی ہے۔

صفحات — 521، قیمت — 590 روپے

جدید — ہندی اردو لغت (دو جلدوں میں)

مرتب: پروفیسر نصیر احمد خاں

تکنیک اور ترتیب و تقسیم کے اعتبار سے ''جدید — ہندی اردو لغت'' اپنی نوعیت کی واحد لغت ہے جس میں قدیم و جدید ہندی کے الفاظ، ان کے تلفظات، ماخذ اور نحوی زمروں کے علاوہ معنی و مفہوم کو اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ماہر لسانیات پروفیسر نصیر احمد خاں کی مرتب کردہ یہ لغت ایک مفید، کارآمد اور سنجیدہ کاوش ہے جو اردو اور ہندی کے طلبہ کی بیشتر ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔

صفحات: 3286 (دونوں جلدیں)، قیمت -/1640 روپے (دونوں جلدیں)

عظیم اقبال

حکمتِ عملی

ایک دفعہ ایک عرب شیخ اپنی ریاست کا دورہ کر رہے تھے۔ پوری ریاست میں، گاؤں، گاؤں، شہر شہر پہنچ کر لوگوں سے ملنے جلنے اور لوگوں کی پریشانیوں کو سمجھنا اور سلجھانا چاہتے تھے۔ انھوں نے خود کو عوام کی بھلائی کے لیے وقف کر دیا تھا۔ شیخ کی ریاست بڑی نہ تھی، لیکن ان کے ارادے بڑے تھے۔ لوگوں کی زندگی میں بہتری لانا چاہتے تھے۔

ایک گاؤں میں پہنچنے پر شیخ کا گھوڑا اچانک لنگڑا کر چلنے لگا۔ اس کی رفتار بھی کم ہوگئی، ایسا لگ رہا تھا کہ کہیں گھوڑا گر نہ پڑے۔ گھوڑے کی حالت خراب تھی۔ شیخ کو لمبا سفر کرنا تھا اور گھوڑے کے بغیر اپنا سفر جاری رکھنا ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ ان دنوں گھوڑے سفر کے لیے بہترین وسیلے تھے۔ گھوڑے کی وجہ سے سفر کی پریشانیاں کم ہو جاتی تھیں۔

شیخ کو ایک دوسرے گھوڑے کی ضرورت آن پڑی، ایک ایسے گھوڑے کی جو چاق و چوبند ہو اور ان کی پسند کا بھی ہو جو باقی سفر میں ان کا قابلِ اعتبار اور بہترین دوست بھی ثابت ہوا، اچھے اور قابل بھروسہ گھوڑے کی پہچان انھیں تھی۔ کسی ایسے ہی گھوڑے کے وہ طلبگار ہوئے۔

شیخ نے اپنے مشیروں، اہلکاروں اور خدمت گاروں کو حکم دیا کہ سارے علاقے کے گھوڑے ان کے مالکان کے ہمراہ پیش کیے جائیں۔ گھوڑا پسند کرنے سے پہلے گھوڑے کا امتحان لینا ضروری تھا۔

شیخ کے حکم دیتے ہی اس کا اعلان ہونے لگا۔ نقارے بجے، منادی ہوئی۔ شاہی فرمان کے متعلق جس کسی نے سنا، اسے عام کیا۔

''چلو لوگو چلو! حکم عدولی نہ ہو۔ چلو، اور اپنے گھوڑے کا نصیب جگا لو!''

پھر، اپنا، اپنا گھوڑا لیے، سمٹے سمٹے تمام لوگ حاضر ہوگئے۔ سب کا چہرہ رنجیدہ تھا۔ کسی کی آنکھ میں کوئی چمک نہ تھی۔ سب کے ہونٹ مرجھائے ہوئے تھے۔ تاہم، سب کے ذہنوں میں نئے نئے خیال تھے۔ نئے نئے منصوبے تھے۔ نئی نئی ترکیبیں تھیں۔ اپنا گھوڑا بچانے کے لیے ہر کوئی کوشاں تھا۔ ہر کسی کو اپنا گھوڑا عزیز تھا۔ اپنا گھوڑا بیچنے کے لیے کوئی بھی تیار نہ تھا۔ کوئی نہیں چاہتا تھا کہ اس کا گھوڑا شیخ کی ملکیت بنے۔

ایک نے کہا۔

''حضور! میرے گھوڑے کی سانس اُکھڑ جاتی ہے۔ یہ آپ کے کسی کام کا نہیں! یہ آپ کے لیے دردِ سر بن جائے گا۔''

ایک دوسرے نے سر جھکا کر عرض کیا۔

''جناب! میرا گھوڑا بڑا اڑیل ہے! جب یہ اَڑ جائے گا تو آپ کے چابک کی مار اسے ہلا نہ پائے گی۔ آپ کا غصہ بھی اس پر کارگر نہ ہوگا۔''

ایک اور نے کہا

''عالیجاہ! میرا گھوڑا! جتنا خوبصورت ہے اتنا ہی ناکارہ ہے! اسے لیں گے تو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔''

غرض کہ ہر ایک نے اپنے گھوڑے میں کیڑے نکالے۔ ہر ایک نے اپنے جانور کی کمی گنوانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ اس مقابلے میں کوئی کسی سے پیچھے نہ تھا۔

کوئی ایسا نہ تھا جو کہے۔

"میرا گھوڑا تیز گام ہے!"

"میرا گھوڑا اڑیل نہیں..."

"میرا گھوڑا بڑے کام کا ہے۔ یہ آپ کو بالکل مایوس نہیں کرے گا!"

شیخ نے سب کی بات غور سے سُنی۔ وہ سمجھ گئے کہ سب کے بہانے سوچے، سمجھے ہیں، ہر بہانہ بے بنیاد ہے۔ کسی کی بات میں دم نہیں۔ گھوڑا نہ بیچنے کا یہ صرف ایک بہانا ہے۔

ہر کوئی اپنے گھوڑے کے عیب بتا کر اسے اپنے پاس ہی رکھنے پر آمادہ تھا۔ کوئی نہ چاہتا تھا کہ اس کا گھوڑا ان کے پاس جائے۔

شیخ، لوگوں کی چالاکی پر دل ہی دل میں مسکرا دیے۔ انھوں نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ دائیں بائیں دیکھا اور پھر کہا:

"ٹھیک ہے، ہم سب گھوڑوں کی دوڑ کرائیں گے۔ انھیں دوڑتا دیکھیں گے۔ دوڑ میں جو گھوڑا اوّل آئے گا، اسے ہم لے لیں گے۔

شیخ نے بولنا بند کیا تو گھوڑے کے مالکوں نے لمحہ بھر کے لیے چین کی سانس لی۔ کسی نے چہرہ پونچھا، کسی نے پیشانی پونچھی۔ سبھوں کی آخری امید ابھی باقی تھی۔ کسی نے اب تک ہار نہ مانی تھی۔ گھوڑوں کے مالک دل ہی دل میں مزید منصوبہ سازی پر مائل ہو گئے۔ ترکیبیں سوچی جانے لگیں۔ طریقے تلاش کیے جانے لگے۔ ہر ایک کو بس یہی فکر تھی کہ اس کا گھوڑا اوّل نہ آئے۔ دوسرے کا گھوڑا آگے جائے تو جائے۔، اس کا گھوڑا بس نشانے سے قدم دو قدم پیچھے ہی رہے۔ چلے اور چل نہ پائے۔ گرے اور اٹھ نہ پائے۔

گھوڑوں کی دوڑ کے لیے سارے گھوڑے میدان میں اکٹھا کیے گئے۔ گرد کی ایک لہریں اٹھی اور آسمان میں لہراتی ہوئی چادر کی طرح چھا گئیں۔ اس کنارے سے اس کنارے تک بس گھوڑے ہی گھوڑے تھے۔ دم ہلاتے، گردنیں گھماتے، ہنہناتے، اور اپنے مالکوں کے اشارے سمجھتے ہوئے۔ سب کو اپنے گھوڑے پر پورا اعتماد تھا۔ سب جانتے تھے، وہ جو چاہیں گے، گھوڑا وہی کرے گا۔ سب کے گھوڑے سدھے ہوئے تھے۔

پھر، سب کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا گیا۔ سفید، کالے، بھورے، چتکبرے، چھوٹے، بڑے۔ سارے گھوڑوں کی دوڑ اب شروع ہی ہونے والی تھی۔ صرف حکم کا انتظار تھا۔ عجیب سماں تھا۔ ماحول بوجھل تھا۔ ہوا بھی تھمی ہوئی لگ رہی تھی۔ گھوڑوں کے مالک دم سادھے ہوئے تھے۔

ماتحتوں سے سب کچھ چست درست ہونے کی اطلاع مل گئی۔ نگراں تعینات ہو گئے۔ دوڑ سے ذرا پہلے شیخ نے خطاب کیا۔ ان کا لہجہ اٹھان پر تھا۔ شیخ کی آواز گونج اٹھی۔

"لوگوں، سنو! اب سب اپنا اپنا گھوڑا چھوڑ کر ایک دوسرے کے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ جاؤ، دیر نہ کرو، اور لوگو، یہ بھی یاد رکھو، جو گھوڑا اوّل آئے گا، وہ اوّل آنے والا گھوڑا میرا ہو جائے گا۔"

شیخ رُکے، پھر بولے۔

"چلو، چلو، جلدی کرو۔ ایک، دو...... تین......!"

□□□

پتہ:
Adabistan, Ganj No.1, Bettiah-845438 (Bihar)

اسکول جائیں گے

اب علم کا چراغ جہاں میں جلائیں گے
اسکول جائیں گے چلو اسکول جائیں گے

دولت یہ علم کی نہ چرا پائے گا کوئی
ایسا خزانہ ہے نہ گھٹا پائے گا کوئی

سچائی ہے یہ سارے جہاں کو بتائیں گے
اسکول جائیں گے چلو اسکول جائیں گے

پڑھ لکھ کے اپنے دیس کے لیڈر بنیں گے ہم
گاندھی، کلام اور جواہر بنیں گے ہم

اعلیٰ مقام ہم بھی زمانے میں پائیں گے
اسکول جائیں گے چلو اسکول جائیں گے

علم و عمل سے ہوگا منور ہر اک دماغ
روشن جہاں میں کرنا ہے اب علم کا چراغ

جو لوگ سو رہے ہیں انھیں ہم جگائیں گے
اسکول جائیں گے چلو اسکول جائیں گے

بچو کبھی نہ بھول کے اسکول چھوڑنا
اپنی بلندیوں سے کبھی منہ نہ موڑنا

ہم گاندھی جی کے سپنے کو سچ کر دکھائیں گے
اسکول جائیں گے چلو اسکول جائیں گے

حیوان ہے یہ آدمی تعلیم کے بنا
ہوگی نہ قدر پرکھوں کی تنظیم کے بنا

نقصان سب کا ہوگا اگر بھول جائیں گے
اسکول جائیں گے چلو اسکول جائیں گے

نازاں کا پیارے بچو یہی اب پیام ہے
بھارت کا آج علم سے اعلیٰ مقام ہے

پیارے ترنگے ہم تری عزت بڑھائیں گے
اسکول جائیں گے چلو اسکول جائیں گے

نازاں جمشید پوری
پتہ:
Khawaja Bukhsh Manzil, Main Road, P.O. Azadnagar,
Jamshedpur-832110

چاند

ایک بتاشہ دودھ سا اجلا، اک چاندی کا پیسہ چاند
وہ دیکھو آکاش پہ نکلا، گول سی روٹی جیسا چاند

چاند میں بیٹھی بڑھیا نانی کات رہی ہے سوت اپنا
جانے کتنی صدیوں سے وہ دیکھ رہی ہے کیا سپنا

اس کی کٹیا سے کچھ آگے ایک محل ہے سونے کا
اس میں اک تالاب ہے جس میں نیل کنول ہے سونے کا

کہتے ہیں تالاب میں ہردم شہد کی نہریں بہتی ہیں
یہ بھی سنا ہے اسی محل میں سندر پریاں رہتی ہیں

اڑتے اڑتے راتوں میں وہ دنیا میں آجاتی ہیں
جھولے میں سوتے بچوں کو میٹھے خواب دکھاتی ہیں

نٹ کھٹ سی جب کوئی پری بچے کو بوسہ دیتی ہے
تب ننھے کے ہونٹوں پر مسکان کی لہریں لیتی ہے

چاند کی اس دنیا کے بچو! راز تو سارے جانے کون
آموں اور امرود کے اس میں باغ بھی ہیں پر مانے کون

شریف احمد شریف

27 مارچ 2010، قومی اردو کونسل کے صدر دفتر 'فروغ اردو بھون' ,FC-33/9 انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی کی افتتاحی تقریب کے موقعے پر کمپیوٹر ایپلی کیشنز اینڈ ملٹی لنگول ڈی ٹی پی کے طلبہ وطالبات کو اسناد پیش کرتے ہوئے مقامی ایم ایل اے آصف محمد خاں۔ ساتھ میں قومی اردو کونسل کے وائس چیئر مین چندر بھان خیال، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور پروفیسر اختر الواسع۔ اس موقعے پر سامعین کی تصویر (نیچے)۔

RNI No. 70323/99
DL-SW-16/4104/2009-11
Date of Publication : 24/04/2010
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

قومی اردو کونسل کا معتبر علمی جریدہ

''فکر و تحقیق''

جو ہر سہ ماہی پر دعوت فکر دینے والے تحقیقی مواد کے ساتھ منظر عام پر آتا ہے

جس میں شائع ہونے والے مضامین کا خاصہ ہے معلوم حقائق کی چھان بین اور نامعلوم حقائق کی دریافت

صرف ایک جریدہ نہیں، ماضی کے اندوختوں اور حال کے

اکتسابات سے مستقبل کو مالا مال بنانے کی ایک تحریک

خود بھی اس رسالے کے خریدار بنیں اور دوسروں کو بھی اس کی خریداری کا مشورہ دیں۔

ہندوستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت : 100 روپے، فی شمارہ 25 روپے

زر سالانہ بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

[redacted]

غیر ملکی خریداروں کے لیے

ممالک	سادہ ڈاک آرڈنری	سادہ ڈاک رجسٹرڈ	ہوائی ڈاک آرڈنری	ہوائی ڈاک رجسٹرڈ
پاکستان	172 روپے	184 روپے	256 روپے	316 روپے
نیپال	160 روپے	228 روپے	292 روپے	360 روپے
بنگلہ دیش	146 روپے	174 روپے	238 روپے	306 روپے
دیگر ممالک	160 روپے	220 روپے	336 روپے	396 روپے

Printed and Published by Dr. M. Hamidullah Bhat, Director, NCPUL on behalf of NCPUL, FAROGH-E-URDU-BHAWAN, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi-110025, and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Industrial Area, Phase-II, New Delhi-110020 on 70 GSM Paper produced by TNPL Editor : Dr. M. Hamidullah Bhat, Tel : 49562525